میری زندگی سراب میں گزری

انڈویجوئل لینڈ پاکستان

میری زندگی سراب میں گزری

انڈو یجوئل لینڈ پاکستان

مرکزی مصنف: گلمینہ بلال احمد

مدیر: محمد ریاض

معاون مدیران: سندس سیدہ، ذوالفقار حیدر، یحییٰ احمد، فرحان خالد، ریحان علی۔

ڈیزائن کردہ: عدیل امجد

فیلڈ ریسر چرز: ہم اپنے فیلڈ ریسر چرز غلام مصطفٰے اور وہاب بلوچ کا شکریہ ادا کرنا چاہیں گے جنہوں نے اس اشاعت کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلیئے پہلی سیڑھی کا کردار ادا کیا اور کراچی کے پُرخطر علاقوں میں انٹرویوز کیئے۔

مزید برآں، اس پورے کام میں مسلسل تعاون کے لئے احمد یونس، شوکت علی اشرف اور سید فہد الحسن کے ہم خاص طور پر شکر گزار ہیں۔ ان کے بغیر ہم اس کاوش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب نا ہو پاتے۔

یہاں پیش کی جانے والی معلومات مختلف ماہرین کی جانب سے فراہم کئے جانے والے مواد کے بغیر ممکن نا تھیں۔ ہر قسم کا تعاون حاصل کرنے کے باوجود، مرکزی مصنف کسی بھی طرح کی غلطیوں کے لئے ذاتی طور پر ذمہ داری قبول کرتا ہے۔

انڈویجوئل لینڈ

مکان نمبر ۲ ابی، اسٹریٹ ۲۶، ایف ۸/۱، اسلام آباد- پاکستان

ٹیلی فون: +92-51-225-3437, 225-3438

ای میل: info@individualland.com

ویب سائیٹ: www.individualland.com

آئی ایس بی این: ۹۷۸-۹۶۹-۹۵۸۲-۲۶-۴

شائع کردہ کاپیوں کی تعداد: ۶،۰۰۰

فہرست

حالات کا جائیزہ ۳

مائیں ہی کیوں؟ ۷

ماں کی عدالت ۱۳

سوال کرنا منع ہے ۱۳

ماؤں کی فریاد ۱۴

ماؤں کی تلاش میں ۱۴

فیلڈ ریسرچرز کی خدمات کا حصول ۱۵

متاثرہ مائیں ۱۶

ماؤں کی آواز ۱۶

انتہا پسندی کے اسباب ۱۷

دہشت گرد کا آغاز ۲۰

مذہبی دہشتگردوں کا اثر ورسوخ ۲۲

بری صحبت ۲۲

گمشدہ ۲۵

مذہبی ہونے کا جرم یا کچھ اور۔۔۔؟ ۲۵

قصوروار؟ ۲۷

شہریوں کی حکومت پر بے اعتمادی ۲۹

متاثرہ ماؤں کی فریاد ۲۹

بے حسی ۳۱

مادرانہ مشورہ ۳۲

ریاست اور مرتکب افراد کا کردار ۳۳
بے جا یقین کا انجام ۳۵
وہ میرا بیٹا ہے میں اسے جانتی ہوں ۳۶
نااہلی کا شکار ۳۸
بے بسی ۳۹
احمقانہ قتل ۴۱
میں نے سب کچھ کھو دیا۔۔۔ ۴۲
قوتِ برداشت ۴۴
انکار ۴۴
جہالت کے فریب ۴۷
اچھی عادت کا مالک ایک لڑکا۔۔۔ ۵۰
مقصدی تشدد ۵۱
درست اور غلط ۵۳
ذمہ دار کون؟ ۵۴
اختتامیہ ۵۷
کام کے حوالہ جات ۶۱

حالات کا جائزہ

پاکستان کے مختلف شہروں میں پھیلنے والے سیاسی اور فرقہ وارانہ تشدد نے پاکستان کو دنیا کا ایک خطرناک ملک بنا دیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں، جہاں ہر کوئی ایک دوسرے سے خوف زدہ ہے۔ خوف اور بدعنوانی نے پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ خوف سے شہریوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک جنوبی ایشیائی سیاست دان، جنہوں نے اپنی زندگی کے بیس برس قید میں گزارے ان کا کہنا ہے کہ "خوف بدعنوانی پھیلاتا ہے"۔ جس انسان کو خوف کا سامنا ہو وہ لڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ تشدد نے بنی نوع انسان کی تاریخ کو داغ دار کر دیا ہے۔ طاقت کا بدترین استعمال قدیم یورپ اور دنیا کے دیگر حصوں میں ریاست اور کیتھولک چرچ کا مرکزی ہتھیار رہا ہے۔ مقدس جنگیں بھی اسی دنیاوی تشدد کی توسیع ہوا کرتی تھیں اور اب بھی ایسا ہی ہے۔ لوگوں کا اپنے حقوق اور شناخت کے لئے لڑنا تو ازل سے چلا آ رہا ہے جواب اپنی پہچان ایک آزاد اور خودمختار انسان کی حیثیت سے کروانا چاہتے ہیں۔ وطن، عقیدے، سیاسی نظام اور ثقافت کے لئے جدوجہد ایسی ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ ایک قوم، ایک مذہب اور انسانیت کا رشتہ ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ صدیوں سے، ظالم اور مظلوم، آزادی کی جنگ لڑنے والے اور جارح، پاکیزہ اور گناہ گار اپنی اپنی قومی شناخت، ممالک، فرقوں اور نظریات کا دفاع کرنے کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ تاہم، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، تشدد نے سیاسی نظریے سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ اب ہم ایک غیر سیاسی وقت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ قاتل کو معلوم نہیں کہ وہ کیوں قتل کر رہا ہے اور مقتول کو معلوم نہیں کہ وہ کیوں قتل کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ملک میں یہ صورتحال ہے کہ جو مار رہا ہے اور جو مر رہا ہے دونوں ایک ہی خدا کے ماننے والے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان دنیا بھر میں دہشتگردی سے متاثر ہونے والے ملکوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ جنوری ۲۰۱۳ء سے ستمبر ۲۰۱۳ء میں ہونے والے دھماکوں کی تعداد ۴۵۲

ہے اور اس میں لقمہ اجل بننے والے ۱۴۰۰ افراد کے ساتھ ساتھ زخمیوں کی تعداد تقریباً ۳۳۹۵ بتائی جاتی ہے۔ یہ تو صرف ۹ ماہ ہیں جن میں ہزاروں گھروں کے چراغ گل ہوئے، پاکستان میں ہزاروں خاندان دہشتگردی کی لعنت سے متاثر ہو چکے ہیں۔ زیادہ تر دھماکوں کے بعد ملنے والی خبر یہ ہوتی ہے کہ اس کے پیچھے کسی کالعدم تنظیم کا ہاتھ ہے، اس کے بعد کیا ہوتا ہے اس بارے میں مجھے یا آپ کو کچھ معلوم نہیں کیونکہ ہم عام عوام ہیں۔ بے شک ان دھماکوں میں اڑنے والے چیتھڑے ہمارے ہی پیاروں کے ہیں کبھی ہم سوچتے تھے کہ یہ سب کرنے والوں کے گلوں تک ہم پھانسی کا پھندہ نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن پشاور میں پیش آنے والے حالیہ واقعے کے بعد ایسا ہونے لگا ہے ہمارے پیاروں کے قاتلوں کو سزائیں دی جانے لگی ہیں۔ نا جانے اس کے نتائج کیا ہوں گے؟ شاید ان ماؤں کو کچھ سکون مل جائے جنہوں نے اپنے لختِ جگر کھوئے ہیں، شاید ان کو یہ تسلی ہو جائے کہ ان کے بچوں کے مجرم آزاد نہیں ہیں ان کو انصاف مل رہا ہے اور ان کے مجرموں کے خلاف قانونی کاروائی کی جا رہی ہے۔ رنگ، نسل، فرقہ واریت کی آڑ میں کھیلی جانے والی جنگ کے ساتھ ساتھ یہ نام نہاد جہاد کے نام پر کھیلی جانے والی شطرنج نہ جانے کب تک دہشتگرد ہی جیتتے چلے جائیں گے؟ نا جانے دہشتگروں کو پھانسیاں دینے اور عوام کو انصاف فراہم کرنے کا یہ عمل جاری رہ سکے گا یا اس کو پھر روک دیا جائے گا؟

۲۰۰۱ء سے لے کر ۲۰۱۴ء تک پاکستان میں تیس سے زائد دہشتگرد اور عسکریت پسند تنظیمیں کالعدم قرار دیں گئیں۔ لیکن اب تک کالعدم تنظیمیں بہت منظّم طریقے سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کبھی تنظیم کا نام تبدیل کر لیا جاتا ہے تو کبھی صرف ایک نقطہ جہاں محرم کو مجرم بنا دیتا ہے وہاں یہ تنظیمیں بھی اسی ایک نقطے کا سہارا لے کر ہماری آنکھوں میں دھول جھونک دیتی ہیں، آئے دن وہ نام تبدیل کر کے اپنی سرگرمیاں جاری رکھتی ہیں۔ پشاور کے اسکول میں پیش آنے والے واقعے کے بعد بھی ٹیلی ویژن میں جن تنظیموں کو جائے وقوعہ پر فوری امداد فراہم کرتے دیکھایا گیا ان میں بھی ایک نہایت سرگرم کالعدم تنظیم کے لوگوں کو امداد فراہم کرتے دیکھایا گیا بلا شبہ وہاں دوسرے امدادی ادارے بھی موجود تھے۔ ایسی صورتحال میں جب لوگوں کی فلاح و بہبود کی بات کی جائے وہاں کالعدم اداروں کا امداد

فراہم کرنا اور لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹنا، ان کو اپنی جانب راغب کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ تو ایک واقعہ تھا۔ تھر میں قحط سالی ہو یا ایمبولینس کی ضرورت ان تنظیموں کا ہر موقعے پر پہنچنا اور کالعدم ہونے کے باوجود سرِ عام اپنے کام جاری رکھنا ملک اور عوام کے لیے خطرہ ہے۔

پشاور کے اسکول میں پیش آنے والے واقعے میں سینکڑوں گھروں کے لختِ جگر ان سے جدا ہو گئے، کسی کے بیٹے کسی کی بیٹیاں کسی کی مائیں بہنیں سبھی خاندان کس قدر قسم پرسی کی حالت میں ہیں اس کا انداز شاید ہم نہیں لگا سکتے۔ ایک ہی اسکول کے سینکڑوں طالب علم ابدی نیند سلا دیے گئے، انسانی عقل کسی صورت یہ قبول نہیں کرتی کے کوئی انسان اس قدر سفاک بھی ہوسکتا ہے کہ وہ معصوم اور بے گناہ لوگوں خاص طور پر بچوں کو بے دردی سے قتل کرے، جن کا کوئی قصور نہیں کوئی گناہ نہیں، ہاں! اگر ان کو قصور کہیں نظر آتا ہے تو اتنا کہ وہ ایسے ملک میں پیدا ہوئے جہاں قانون ان لوگوں کو پھانسی کے پھندوں تک نہیں پہنچاتا جو کہ ایسے درندہ صفت کاموں میں ملوث ہوتے ہیں۔ ان کا قصور ہے تو صرف یہ کہ وہ تعلیم حاصل کر کے ملک وقوم کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس کاروائی میں ملوث افراد ہمارے معاشرے کا ہی حصہ تھے، اور ہمیں احساس تک نہیں ہوا کہ یہ درندہ صفت انسان ہماری نسلوں کے خون کے پیاسے ہیں۔

کیا کسی کو اس بات کا اندازہ ہے کہ ہماری تمام نسلوں کو ان درندوں نے کس بری طرح متاثر کیا ہے؟ ایک وہ نسل ہے جس کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا، جن میں سے بے شمار شہید ہو گئے اور وہ معصوم بچے جو اس اسکول میں اس وقت موجود تھے ان کے ذہنی جسمانی کیفیت کیسی ہے اس کا اندازہ ہم نہیں لگا سکتے، وہ بچے جو مختلف اسکولوں میں جاتے ہیں ان کے اسکولوں میں تربیت دی گئی کہ اگر ان کے اسکول پر حملہ ہو جاتا ہے تو وہ کیا تدابیر اختیار کریں۔ اس نسل کو تو خوف میں مبتلا کر ہی دیا گیا ہے اور ان کی کونسلنگ کرنے والا بھی کوئی نہیں ان کی ہمت بندھانے والا کوئی نہیں نا جانے وہ نوجوان جب اسکول میں واپس جائیں گے تو ان کے کیا احساسات ہوں گے؟ جب کوئی ماں کسی ہمسائے کے بچے کو اسکول جاتا دیکھے گی تو اس کے کلیجے پر کیسے خنجر چلیں گے، خاندان کے تمام افراد تو ہوں گے لیکن ان میں جب

ایک بچے کی کمی ہوگی تو ہر چیز کا مزہ کتنا سونا ہو جائے گا۔ اف!!! یہ قرب اور اذیت اس سے معاشرے کے افراد کو نکالنے کے لیے ہمیں اور آپ کو مل کر تگ و دو کرنی پڑے گی۔ صورتحال تو یہ ہے کہ ان کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ان ہی میں سے بے شمار جذباتی نوجوان نا جانے بدلہ لینے کی آگ میں کیسے جل رہے ہوں گے، ان ہی میں سے بے شمار نا جانے کیسے تعلیم دوبارہ جاری رکھ سکیں گے۔ دوسری جانب معصوموں کی مائیں بہنیں ہیں ان میں اسکول کا اسٹاف ان میں کتنی ہمت ہوگی کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجیں، وہ باپ جو اپنے جوان بیٹوں کا جنازہ اٹھا رہے تھے ان کے دلوں میں اپنے بچوں کو کسی اعلیٰ مقام پر دیکھنے کے خواب ارمان بن کر رہ گئے۔ کیا کسی کو اندازہ ہے کہ کس طرح ایک بچہ جوان ہوتا ہے؟ آخر ہم یہ سب کام کرنے والے لوگوں کو کیا کہیں کیا ہم انہیں انسانوں کی فہرست میں شمار کر سکتے ہیں؟

سب کو اس وقت کونسلنگ کی ضرورت ہے، ان کی ذہنی کیفیت نہایت متاثر ہو چکی ہے اور یہ نہایت خطرناک ہوگا اگر فوری طور پر ان کی درست سمت راہنمائی نہیں کی گئی۔ بلاشبہ ڈاکٹر رضوان تاج کی جانب سے میڈیا پر اعلانات تو کیے گئے کہ متاثرہ خاندانوں کی باقاعدہ کونسلنگ کی جائے گی لیکن میرے کچھ سوالات ہیں۔ کیا یہ سہولیات عام لوگوں کی رسائی میں ہوں گی؟ ہر شخص اس سے مستفید ہو سکے گا؟ یہ ایک اچھا قدم ضرور ہے لیکن آٹے میں نمک کے برابر ہے، پورے پاکستان میں دہشتگردی کے جو حالات ہیں اس صورت میں کونسلنگ سنٹرز اور ان سہولیات کی ضرورت بڑے پیمانے پر ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور محلوں کی سطح پر بھی کونسلنگ کی سہولیات فراہم کی جانی چاہیں۔ بہت سی کالعدم تنظیموں کے نوجوانوں کے گروپ ہیں جو کالج اور یونیورسٹیوں کی سطح پر سرگرمیاں منعقد کرواتے ہیں۔ ان کی راہنمائی کی جائے تاکہ وہ کالعدم تنظیموں سے آگاہ ہوں۔

اس سانحے کے بعد بھی وہی سوال سامنے آیا جو ہمیشہ ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ آخر یہ دہشتگرد کہاں سے آتے ہیں؟ جس کا جواب نہایت سیدھا ہے: نا ہی یہ کوئی خلائی مخلوق ہیں نا ہی حشرات ہیں۔ یہ سب ہمارے آس پاس ہی موجود ہیں، آپ کا درزی، اخبار والا، چوکیدار، یا آپ کے یا میرے بیٹے یا بھائی کا کوئی دوست بھی ہوسکتا ہے۔ ہمارے درمیان موجود دین کے ٹھیکیدار ہمارے ہی بچوں کو

کیسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں، ہم آج تک یہ جان ہی نا سکے کہ یہ سب ہمارے آس پاس بسنے والوں کی ہی زندگی کی حقیقت ہیں یہ کوئی اور نہیں بلکہ یہ ہمارے آس پاس بسنے والے ہی ہیں جو ہمارے پیاروں کے خون کے پیاسے ہیں۔ اگر یہ ہمارے درمیان ہی موجود ہیں ہم میں سے ہیں تو آخر کیسے یہ اس آگ کی لپیٹ میں آ گئے؟ انہوں نے کیسے اتنے گھروں کے چراغ گل کیئے؟ اب وہ کہاں ہیں ان کی ماؤں کے دلوں پر کیا گزر رہی ہے۔ ان ہی تمام سوالوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم ان دہشتگردوں، مجرموں اور متاثرین کی ماؤں سے ملے اور ان سے جاننے کی کوشش کی کہ آخر کیا وجہ تھی کہ ان کے بچے نے یہ راستہ اپنایا؟ ہم نے ان ماؤں کے احساسات بھی جانے جن کے لختِ جگر ان حالات کا نشانہ بنے اور ماں کو روتا چھوڑ کر منوں مٹی تلے جا سوئے۔ یہ تحریر اس واقعے سے پہلے کی ہے لیکن اس کا ترجمہ کرتے وقت پشاور میں ہونے والے واقعے کے بارے میں لکھنا اس لیے ضروری تھا کہ آخر وہ بھی تو مائیں ہیں جن کے لختِ جگر ان کو روتا چھوڑ کر منوں مٹی تلے جا سوئے۔ ان کے احساسات بھی یقیناً ایسے ہی ہوں گے جن ماؤں کے احساسات ہم نے قلمبند کیئے ہیں۔ ہم نے ماؤں کی احساسات کو جاننا اس لیے ضروری سمجھا کیونکہ کوئی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ایک بچے کی پرورش میں ایک ماں کا کردار نہایت اہم ہے۔ وہ کبھی بھی نہیں چاہے گی کہ اس کا بچہ کوئی برا کام کرے لیکن پھر بھی کیا وجوہات ہیں جن کی وجہ سے نوجوان ایسی سرگرمیوں کی طرف جاتے ہیں اور ان کی ماؤں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ ان کی اولاد آخر کیا کر رہی ہے۔

مائیں ہی کیوں؟

ایک معروف امریکی مضمون نگار، لیکچرر اور شاعر، رالف والڈو ایمرسن نے ایک مرتبہ کہا تھا، ''آدمی ویسے ہی ہوتے ہیں جیسا اُن کی مائیں اُنہیں بناتی ہیں۔'' یہ بات اس سے زیادہ خوب صورت اور سادہ انداز میں نہیں کہی جا سکتی۔ ماں کے کئی کردار ہو سکتے ہیں، اس کا اپنے بچے کی افزائش اور نشوونماء

میں کردار کو سب سے اہم تصور کیا جاتا ہے۔ ماں اپنے بچے کی شخصیت کو سنوارتی ہے اور کسی مخصوص کام کو کرنے یا نا کرنے کے لئے اپنے بچوں کو متحرک کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ ثقافت، سیاست اور مذہبی عقائد افراد کی ذہنیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر فلسطین میں، جو ۱۹۴۰ کی دہائی سے اب تک جنگ کی ایک مسلسل حالت میں گھرا ہوا ہے، بہت سے ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں مائیں اکثر اپنے بیٹوں کی جہاد (مسلح جدوجہد/عسکریت پسندی) کے لئے اور یہاں تک کہ خودکش بم دھماکوں کے لئے حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔

انسان اپنے خاندان کی محبت میں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا ہے اور اسی طرح وہ کسی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے باز بھی رہ سکتا ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ انتہا پسند یا ایسا بننے کے خواہش مند افراد کے خاندان انہیں دہشت گرد تنظیموں کو چھوڑنے پر راضی کرنے میں ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس بات کی تصدیق نائن الیون کے ایک خواہش مند بمبار، مشاب الھملان کی زندگی کی کہانی سے ہوتی ہے۔ افغانستان میں ایک کیمپ سے تربیت حاصل کرنے کے بعد، الھملان سعودی عرب واپس چلا گیا۔ اسے اپنے تربیت کاروں کی جانب سے واضح ہدایات تھیں کہ وہ اپنے خاندان سے رابطہ نہ کرے، لیکن اس نے اپنے خاندان سے رابطہ کیا اور یہ جاننے کے بعد کہ اس کی ماں بیمار ہے، اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ یہ ماں ہی ہے جو ہر حال میں اپنے بچوں کو کسی بھی غلط سمت نہیں جانے دینا چاہتی اور یہ بچے ہی ہیں جن کو اگر راہِ راست پر لانا ہے تو ان کو ان کی ماؤں کی مدد سے سیدھے راستے پر واپس لایا جا سکتا ہے۔

مائیں خاندان کے معاملات چلاتی ہیں اور اپنے خاندانوں میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ کہ مائیں اپنے بچوں میں بنیاد پرستی کی ابتدائی علامات بھانپ لینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ تاہم، یہ بات ابھی تک بحث طلب ہے کہ کیا مائیں اپنے خاندانوں میں پُرتشدد انتہا پسندی پر قابو پانے میں کامیاب رہی ہیں یا نہیں۔ بین الاقوامی سطح پر خاندانوں اور خصوصاً ماؤں کو انتہا پسندوں کی تعلیمات کا قلعہ قمہ کرنے کے عمل میں شامل کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، یہ ہی وجہ تھی کہ ہم

نے ماؤں کے انٹرویوز کیئے اوران سے جاننے کی کوشش کی کہ وہ کس حدتک اپنے بچوں کی سرگرمیوں سے آگاہ تھیں، ان کی اپنے بچے کی سرگرمیوں کے بارے میں کیا سوچ ہے اور وہ کیسے خیالات رکھتی ہیں، دوسری جانب وہ مائیں ہیں جن کے بچے ان ظالم بچوں کے ظلم کا شکار ہوئے وہ ان نوجوانوں کو کیا پیغام دیتی ہیں جو اس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ نائن الیون کے حملوں کے ایک مجرم زکریا موسوی کی ماں عائشہ الوفی اور انہی حملوں کا شکار ہونے والے ایک فرد کی ماں فلس راڈریگس کی ٹیڈ ٹاکس کے ایک پروگرام میں شرکت ایک ایسا واضح نمونہ ہے جس میں ایک مجرم کی ماں اور ایک متاثرہ فرد کی ماں معافی اور بات چیت کی ایک طاقت ور علامت بن گئیں۔

ماں ہی ہے جو اولاد کو غلط اور صحیح کی تمیز سکھاتی ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ کہ ہم اسلام کے نام پر جعلی ملاؤں اور دین کے ٹھکیداروں کے ہاتھوں بک رہے ہیں۔ ایک ماں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بچے میں مذہب، رنگ اور نسل کے تعصب کو پروان نہ چڑھنے دے۔ لیکن آج کل کے دور میں ہماری ماؤں کو بچوں کی سرگرمیوں کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ ان کا کام گھر کے کاموں تک محدود ہے، یا دوسری طرف وہ مائیں ہیں جو اپنی نوکری کے چکر میں بچوں کو نظر انداز کر دیتیں ہیں۔ پاکستان میں بہت سی ایسی مثالیں ہیں جہاں مائیں اپنے بچوں کو دین کے نام پر سر کٹانے پر فخر سے کہتیں ہیں۔ لیکن وہ نہیں جانتیں کہ دین کے نام پر استعمال کرنے والے لوگ بھی ان کے آس پاس ہی موجود ہیں۔ ایک جانب وہ ماں ہے جو اپنے بچے کو فوج میں بھیجتی ہے اور اس کے شہید ہو جانے پر فخر کرتی ہے، دوسری جانب اسی جذبے کو دہشتگرد تنظیمیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہیں ہیں، وہ اسی رتبے کا لالچ دیتے ہوئے قرآن کی بجائے طالبان کی پیروی کرواتی ہیں۔ لیکن پھر ان کا انجام نہایت ہولناک ہوتا ہے جس کی کئی مثالیں ہم اسی تحریر میں آپ کے سامنے رکھیں گے۔

جب کوئی بچہ خودکش دھماکا کرتا ہے تو اکثر مائیں اس کو دیکھ کے افسوس تو ضرور کرتیں ہیں لیکن وہ یہ نہیں سوچتیں کہ کہیں ہمارا اپنا بچہ کسی ایسے کام میں ملوث تو نہیں، بچوں پر بے جا اعتماد ان کو ایسا نا بنا دے جس سے وہ غلط کام کو بھی صحیح سمجھنے لگیں، بلاشبہ ماؤں کو اپنے بچوں کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔

ہمارے معاشرے میں کالعدم تنظیمیں جان لیوا وائرس کی طرح فلاح و بہبود کے کاموں میں ملوث ہیں۔ میں یا آپ تو شاید ان کے بارے میں جانتیں ہوں لیکن ہماری ماؤں کو بالکل نہیں معلوم کہ کون سا ادارہ کالعدم ہے اور اس کو کالعدم کیوں قرار دے دیا گیا یہ ہی وجہ ہے کہ جب ان کا بچہ کسی ایسے ادارے کا لٹریچر بھی پڑھتا ہے تو ان کو معلوم نہیں ہو پاتا کہ وہ کس اندھیرے کنوئیں کی جانب جا رہا ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو دین کی طرف راغب ہوتا دیکھ کر بہت خوش ہوتیں ہیں اور یہ خیال کر لیتی ہیں کہ اب ان کا بچہ ہر شر سے محفوظ ہے کیونکہ ایک نمازی بچہ کیسے کسی غلط کام میں ملوث ہوگا۔ وہ یہ بھول جاتیں ہیں کہ اسلام کی تعلیم کے علاوہ ہمارے درمیان طالبان کی تعلیم دینے والے بھی موجود ہیں۔

انڈو یجوئل لینڈ پاکستان نے ایسی ہی ماؤں کو تلاش کیا اور ان کے احساسات کو قلمبند کیا۔ ان میں وہ مائیں ہیں جن کے بچے تشدد کی نظر ہو چکے ہیں، اور وہ بھی جو اپنے بیٹوں سے جدائی کا صدمہ تشدد تنظیموں میں ملوث ہونے کی وجہ سے برداشت کر رہی ہیں۔ دونوں قسم کی ماؤں سے مختلف سوالات پوچھے گئے اور ان کے ردِعمل یا جوابات کو تحریر کیا گیا۔ ان کے جوابات میں اُن کے بچوں کی زندگیوں کے طرز کے بارے میں واضح اور جامع شہادتیں موجود تھیں۔ ان واقعات کا شکار ہونے والوں کی ماؤں نے ان لوگوں کے لئے پیغامات دیئے جو ان کے بچوں کی موت کے ذمہ دار تھے اور جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ وہ تشدد کرنے والوں کے ساتھ کس قسم کے برتاؤ کی توقع رکھتی ہیں تو ان سب کا ردعمل مختلف تھا۔ اسی طرح، تشدد کرنے والوں کی ماؤں کا اِن سوالات پر ردعمل مختلف تھا۔ امید کی جاتی ہے کہ ان ماؤں کی شہادتیں قارئین کو ان انگنت ماؤں کی زندگی میں جھانکنے کا موقع فراہم کریں گی جنہوں نے ملک کو متاثر کرنے والے تشدد کے ہاتھوں اپنی اولاد کو کھو دیا، چاہے وہ متاثرہ افراد کی مائیں ہیں یا تشدد کرنے والوں کی۔

ایک مثال جس کے مطابق ایک شخص جس کا تعلق قبائلی علاقے سے تھا وہ خودکش حملہ آوروں کا ماسٹر ٹرینر تھا۔ وہ مذہبی درس گاہوں سے نوجوان طالب علموں کو منتخب کرتا تھا، اور انہیں خودکش حملوں کے لئے ذہنی طور پر تیار کرتا تھا۔ اس نے اپنے بھائی اور باپ کو بھی خودکش بمباروں کی تربیت دی تھی۔

اس کی موت کے بعد، دونوں (اس کے بھائی اور باپ) نے مختلف خودکش حملوں میں اپنے آپ کو اڑا دیا تھا۔ پاکستان اصل میں اس قسم کی انتہا پسندی کا شکار ہے۔ پاکستان میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جہاں نوجوان لڑکوں نے اپنے ماؤں یا خاندان کے دیگر ارکان کے جانب سے متحرک کئے جانے کے بعد عسکریت پسند صفوں میں شمولیت اختیار کی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سوات، پاکستان سے تعلق رکھنے والی ماؤں نے نا صرف اپنے زیورات طالبان کی جانب سے کیئے جانے والے نام نہاد جہاد کے لئے عطیہ کر دیئے بلکہ اپنے بیٹوں کو بھی ان کی صفوں میں شامل ہونے کے لئے بھیج دیا۔ روئیے میں ایسی تبدیلی کی بڑی وجہ مولانا فضل اللہ کی جانب سے کی جانے والے شعلہ بیاں تقریریں تھیں جو ''ملا ریڈیو'' کے نام سے بھی مشہور تھا۔ ریڈیو سننے والی مائیں ان کی باتوں میں اس لیے آ گئیں کیونکہ وہ ان کو یہ کہہ کر نشانہ بناتے تھے کہ ان کی مدد کی جائے گی، لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تاہم، وادی میں طالبان کی حکومت کے قیام کے بعد، ان کی حقیقی اصلیت کی قلعی کھل گئی۔ نتیجے کے طور پر، ان ماؤں نے جنہوں نے ماضی میں طالبان کی حمایت کی تھی یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ وہ غلطی پر تھیں۔ ''ڈاکیومنٹنگ ریڈیکلائزیشن'' کے عنوان سے کی جانے والی اسٹیڈی میں، ہماری ملاقات ایسے نوجوان سے ہوئی جس پر عسکریت پسند صفوں میں شمولیت کے لئے اس کی ماں اثر انداز ہوئی تھی۔ تاہم، فوجی آپریشن اور وادی سے طالبان کے انخلا کے بعد، اس نوجوان نے اپنے خاندان، خصوصاً اپنی ماں سے ناطہ توڑ لیا، جسے وہ اپنی تکلیف دہ صورت حال کے لئے ذمہ دار تصور کرتا تھا۔

ان حقیقت پر مبنی کہانیوں سے ہمیں ماؤں کی اہمیت کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کالعدم تنظیمیں ماؤں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ کالعدم تنظیموں کے لٹریچر اور ان کے تمام طریقوں کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ ہی چیز ہمارے سامنے آئی کہ یہ تنظیمیں کس طریقے سے خواتین کو نشانہ بناتی ہیں، ان کے لیے الگ میگزینز، لیکچرز، اور لٹریچر کے علاوہ یہ تنظیمیں شادیاں بھی کرواتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ہدف میں خواتین بھی ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں چھ خودکش حملوں میں خواتین شامل تھیں۔

ہماری تحقیق کا آغاز ان ماؤں کو تلاش کرنے سے ہوا جن کے بچے دہشتگردی یا تشدد کا شکار ہوئے، اور ایسی مائیں جن کے بچے اپنے ہی ہم وطنوں اپنے ہی بھائیوں کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ کیا ماں کی تربیت میں کمی رہ گئی تھی یا ہماری یہ مائیں بچوں کی سرگرمیوں سے بے خبر رہنے کی سزا کاٹ رہی ہیں۔ یہ ہی سب جاننا ہم نے اپنی ان ماؤں سے۔ یہ سب آسان کام نہیں تھا۔ فیلڈ ریسرچرز کی ایسی ماؤں تک رسائی اور ان سے دہشتگردی اور ان کے بچوں کا دہشتگردی سے تعلق کے بارے میں پوچھنا ایک مشکل کام تھا۔ جس ماں کا بچہ اس کو روتا چھوڑ کر چلا گیا اس سے اس بچے کے بارے میں پوچھنا ایسا تھا جیسے ہم اس کے زخم پھر سے تازہ کر رہے ہیں۔ اس کو ماضی میں لے جانا اس کو اس خوفناک لمحے کی یاد تازہ کرا دینا دل موہ لینے والا کام تھا۔ لیکن ان ماؤں سے جن کے بچے دہشتگردی میں ملوث ہونے کی وجہ سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے معصوم لوگوں کی جانوں سے کھیلنے کی سزا بھگت رہے ہیں بات کرنا ایک صبر آزما کام تھا۔ کسی ماں کے اس کے بچے کے بارے میں احساسات اور بے جا اعتماد کو ٹھیس نا پہنچانے کا خیال رکھتے ہوئے سوالات کو اپنے لیے مشکل اور ان کے لیے آسان بنانا بھی ایک آزمائش تھی۔ وہ اپنے ان مجرم اور ملزم بیٹے کے بارے میں کیا کہتیں ہیں ان سے ہی جانا اور ان کے تاثرات اور احساسات کے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی حقیر کوشش کی۔ کسی ماں سے یہ پوچھا جائے کہ آپ کا بیٹا دہشتگردی کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہتیں ہیں تو اس ماں کے لیے یہ ایسی حقیقت تھی جو نہ اُگلی جاتی تھی اور نہ ہی نگلی۔

مندرجہ ذیل ماؤں کے ذاتی تجربات کو دستاویزی شکل دی گئی ہے:

۱۔ ان افراد کی مائیں جو ملک میں دہشت گردی کا شکار ہوئے۔

۲۔ ان افراد کی مائیں جو متشدد اور انتہا پسندی میں ملوث تھے، لیکن اس حقیقت سے غافل تھیں کہ ان کے بیٹے غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔

۳۔ ان ماؤں کا بھی انٹرویو کیا گیا جو یہ سمجھتی تھیں کہ ان کے بچے مذہبی تھے اور وہ مذہبی اجتماعات میں

جانے کے لئے یا مذہبی سرگرمیوں میں شرکت کے لئے گھر سے باہر رہتے تھے، جس کی وجہ سے وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھیں کہ ان کے بچے کالعدم جماعتوں کی کارروائیوں میں ملوث تھے۔

یہ بات ذہن میں رکھنا اہم ہے کہ یہ کہانیاں ہمارے معاشرے میں بسنے والوں کی ہیں ان کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم شاید اپنی مستقبل کی نسلوں کے فائدے کے لئے بنیاد پرستی اور پُرتشدد انتہا پسندی کو روکیں یا کم کرسکیں۔ ماؤں کے احساسات جانتے ہوئے ہمارے سامنے مندرجہ ذیل چیزیں آئیں:

ماں کی عدالت

یہ نہایت افسوسناک حقیقت ہے کہ ہمارے قانون نافذ کرنے والے ادارے بدنام ہیں اور ہم ان پر اعتماد نہی کرتے۔ ہمیں ایسی مائیں بھی ملیں جن کے خیالات بھی کچھ ان ہی سے ہم آہنگ ہیں۔ کچھ ماؤں کے خیال میں قانون مجرموں کو نہیں پکڑتا، اور اگر پکڑتا بھی ہے تو ان کو چھوڑ دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ مائیں ہیں جو اپنے بچوں کی جدائی کا صدمہ عرصہ دراز سے سہہ رہی ہیں ان کا بھی یہ ہی خیال ہے کہ قانون انصاف نہیں کرتا اور ان کے بچے کو بلاوجہ جیل میں رکھا گیا ہے وہ یہ ماننے کو تیار نہیں ہوئیں کہ ان کا بیٹا دہشتگردی میں ملوث تھا۔ حکومت، پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں پر بے اعتمادی کا واضح ثبوت ہے کہ ہم کسی حال میں بھی ان پر اعتماد نہیں کرتے۔

سوال کرنا منع ہے

ہم لوگوں کو یہ سکھایا گیا ہے کہ جہاں پر مذہب کی بات ہو اس کے آگے سوال نہیں کرنا اس کی ایک مثال وہ ماں ہیں جو یہ سمجھتی ہیں کہ طالبان حق پر ہیں اور ان کی اندھی پیروی کرنے والے ان کے بیٹے بے قصور ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اسلام کی طرف راغب ہونا فخر کی بات ہے، لیکن یہ معصوم مائیں یہ نہیں جانتیں کہ اسلام کے نام پر کھیلی جانے والی یہ شترنج آخر ان کے بچوں کو کس راہ پر لے کے جا رہی ہے۔ پاکستان جیسے معاشرے میں جہاں ماں کا فرض گھر سنبھالنا اور بچوں کی تربیت کرنا ہے، وہ اپنے بچوں کی ان سرگرمیوں سے بے خبر رہتیں ہیں جن میں وہ گھر سے باہر ملوث ہوتے ہیں۔

ماؤں کی فریاد

وہ مائیں جنہوں نے اپنے بیٹوں کو زمانے کی سرد و گرم سے محفوظ رکھ کے جوان کیا لیکن زمانے اور زمانے والوں کی سنگدلی نے ان کے بچے کو ان سے جدا کر دیا۔ ان کے بچے ان سے چھن جانے پر ہر ماں کے تاثرات تو ایک جیسے ہی ہیں، لیکن وہ ان درندہ صفت انسانوں کو کیا پیغام دیتیں ہیں ہر ماں کا اپنا انداز تھا۔ جن کی چند مثالیں آپ کے سامنے پیش ہیں:

ہمیں ایسی مائیں بھی ملیں جو لاچارگی اور بے بسی میں سب سے مایوس ہو کر پھر اسی سہارے یعنی اللہ سے ہی انصاف کی امید لگائے بیٹھی تھیں، تو کہیں کوئی قانون نافذ کرنے والے اداروں اور حکومت کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلاتی ماں تھیں، ایسی ماں جو اپنے بچے کے چھن جانے کے بعد بھی ان درندہ صفت بیٹوں کو انسانیت کا درس دیتی اور پیار سے سمجھانے کے ہی حق میں ہے، اور وہ ماں بھی جو اس قدر ٹوٹ چکی ہے کہ اس کا کہنا ہے اگر اس کے بچے کے قاتل اس کے سامنے آجائیں تو ان کو وہ مار کے سمجھائیں گی۔

ماؤں کی تلاش میں

پرتشدد انتہا پسندی کی وجہ سے پاکستان میں انسانی اموات کے اعداد و شمار کے تناظر میں، ہم بلا خوف و خطر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک قومی مسئلہ ہے۔ کراچی، کوئٹہ اور پشاور جیسے کچھ شہروں میں حالت کچھ زیادہ ہی خراب ہیں۔ ہم نے اپنے فیلڈ ریسرچرز کے ذمے ان ماؤں کے بارے میں معلومات جمع کرنے کا کام لگایا جو پرتشدد انتہا پسندی کے نتیجے میں اپنے بیٹوں سے جدا ہوگئی ہیں۔ ان میں وہ مائیں بھی تھیں جن کے بچے ان واقعات کا نشانہ بنے اور وہ بھی جو اس کے مجرم تھے۔ تاہم، یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہمارے فیلڈ ریسرچرز نے ایسے ماؤں کی نشان دہی کر دی، لیکن انٹرویوز کے لئے ان کی یا ان کے خاندان کی منظوری حاصل کرنا انتہائی مشکل تھا۔ کہیں ماں کی بجائے خاندان کا مرد رکن یا سرپرست بات

کرنا چاہتا تھا۔ کچھ خاندانوں کو یہ غلط تاثر ملا تھا کہ ہم مالی طور پر یا کسی اور طریقے سے ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں، جو ٹیم کے لئے ایک اخلاقی مخمصہ بن گیا۔ یہ اشاعت ان سترہ کہانیوں کا خلاصہ ہے جو انٹرویو کی جانے والی ماؤں سے حاصل ہوئیں۔

ہم نے ماؤں کے ساتھ، عموماً ان کے اپنے گھروں میں ہی تفصیلی بات چیت کی۔ متبادل جگہوں پر ملاقاتیں ممکن نہ تھیں جس کی وجہ معلومات کی حساسیت اور خواتین کی ان مقامات تک رسائی میں حائل مسائل تھے۔ انٹرویو کی جانے والی کچھ ماؤں نے ایک ہی بار میں اپنے کہانیاں بیان نہیں کیں۔ کبھی کبھار انٹرویو کرنے کے لیے ہماری ٹیم کو بار بار جانا پڑا اور ان کا اعتماد بحال کرنا پڑا۔

مجموعی طور پر، پورا عمل طویل اور تین مراحل پر مشتمل تھا:

فیلڈ ریسرچرز کی خدمات کا حصول

فیلڈ ریسرچرز کی نشان دہی کی گئی اور انہیں تلاش کردہ ماؤں کے انٹرویوز کرنے کے لئے شارٹ لسٹ کیا گیا۔ انہیں فیلڈ کے کام میں ان کے تجربے، انٹرویو کرنے کی اہلیت اور کسی ناخوشگوار صورت حال سے نمٹنے کے تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے منتخب کیا گیا۔ ہمارے فیلڈ ریسرچرز کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ 'کیا، کب، کون اور کیسے' مخصوص قسم کے سوالات نہ کریں بلکہ ایسا ماحول دیں جس میں ماں اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں پرسکون محسوس کر سکے۔ سترہ ماؤں میں سے، کچھ نے تو ہماری ریسرچ ٹیم کا انٹرویو بھی کر ڈالا اور ان سے چھان بین کی۔ شروع میں کچھ ماؤں نے ریکارڈر یا قلم کے ذریعے نوٹ تحریر کرنے کی اجازت نہ دی۔ تاہم تسلی ہو جانے کے بعد ہمیں انٹرویوز کی ویڈیو ریکارڈنگ کرنے کی اجازت دے دی۔ انٹرویو کے دو علیحدہ شیڈول تیار کئے گئے (ایک متاثرہ افراد کی ماؤں کے لئے اور دوسرا تشدد کا ارتکاب کرنے والوں کی ماؤں کے لئے) تھے۔ انٹرویوز ان شیڈولز کے مطابق کئے گئے، اس لئے انہیں بڑی احتیاط سے مرتب کیا گیا۔ اس بات کو یقینی بنایا گیا کہ صورت حال کی حساسیت کی وجہ سے کوئی متنفر کرنے والا سوال نہ پوچھا جائے۔

متاثرہ مائیں

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، ماؤں کی نشاندہی (ارتکاب کرنے والوں اور متاثرین دونوں کی) ایک آسان کام نہ تھا۔ یہاں تک کہ ان کی نشان دہی کے بعد بھی، فیلڈ ریسرچ کی ٹیم کو انٹرویوز دینے کے لئے ان کی مرضی حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ متاثرہ افراد کی ماؤں کے انٹرویوز کے لئے رضامندی کا حصول قدرے آسان تھا کیوں کہ شاید وہ اپنے درد سے پوری دنیا کو آگاہ کرنا چاہتی تھیں۔ تاہم، تشدد کا ارتکاب کرنے والوں کی ماؤں نے اپنی پوری کہانیاں فوری طور پر نہیں سنائیں۔ ان کی نشان دہی میں بھی مشکل پیش آئی تھی۔ عموماً یہ سوچا گیا کہ انتقامی کارروائی کے خوف سے تشدد کا ارتکاب کرنے والوں کے خاندان منظر عام سے دور رہتے ہیں اور یہ نہیں چاہتے کہ اُن کی نشاندہی ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ فیلڈ ریسرچ ٹیم کو پہلے ایسی ماؤں کی نشان دہی میں مشکل پیش آئی اور پھر اس کے بعد انہیں انٹرویوز دینے پر تیار کرنے میں۔ ان میں زیادہ تر نے یا تو انکار کر دیا تھا، یا وہ بولنے سے ہچکچا رہی تھیں یا وہ اس بات سے ناواقف تھیں کہ ان کے بچوں نے دہشت گردی کا راستہ اپنا رکھا تھا۔ چنانچہ، انہیں پرسکون کرنے اور یقین دہانی کرانے کے لئے خاصی کوشش کی گئی۔

ماؤں کی آواز

ہم نے جن تشدد کا ارتکاب کرنے والوں کی ماؤں کا انٹرویو کیا ان کے پاس اپنے بچوں کی حمایت کرنے کی وجوہات موجود تھیں۔ وہ یا تو اپنے بچوں کی سرگرمیوں سے ناواقف تھیں، یا وہ مذہب کے نام پر بری طرح الجھن کا شکار ہو کر یہ یقین کر بیٹھی تھیں کہ ان کے بچے ایسی سرگرمیوں کی ادائیگی کرتے ہوئے دراصل مذہبی ہدایات پر عمل کر رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں کچھ کو یقین تھا کہ ان کے بچوں پر الزامات کے باوجود، وہ معصوم تھے اور انہیں ریاست نے نشانہ بنایا تھا۔ مثال کے طور پر، تشدد کا ارتکاب کرنے والے شوکت نامی فرد، جو اَب جیل میں ہے، کی ماں نے الٹا ایک سوال کر ڈالا،

''کیا شوکت کی گرفتاری کے بعد پاکستان میں امن قائم ہوگیا ہے؟؟؟ دہشت گردی اُسی طرح جاری ہے، یہ کیوں نہیں رکی؟ حالانکہ میرا بیٹا جیل میں ہے..... بدقسمتی سے، یہاں کسی کو انصاف نہیں ملتا..... صرف خدا اور حکومت ہی دہشت گردی کو کم کر سکتے ہیں۔ کسی اور کے پاس ایسا کرنے کی طاقت نہیں ہے۔''

دوسری جانب، دہشت گردی کا شکار ہونے والوں کی مائیں بھی اپنے آپ کو مجبور محسوس کرتی ہیں اور اس نقصان کے لئے ریاست کو ذمہ دار ٹھہراتی ہیں۔ عثمان نامی متاثرہ فرد کی ماں، لال بی بی یہ سمجھتی ہے کہ دہشت گردی اور تشدد کی وجہ نوجوانوں کے لئے ملازمت اور تعلیم کے مواقع نا ہونا ہے۔ اس کی رائے یہ ہے کہ یہ حکومت کا فرض ہے کہ شہریوں کو تعلیم اور ملازمتوں کے مساوی مواقع فراہم کرے۔ تاہم، حکومت ان معاملات کو حل کرنے میں بہت کم دلچسپی رکھتی نظر آتی ہے۔ ہم نے بہت سے ایسے مسائل اور عوامل کی نشان دہی کی جو اکثر ماؤں کو اپنے بیٹوں کو ان جیسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے لئے متحرک کرتے ہیں۔ دوسری جانب، تشدد کا شکار ہونے والوں کی ماؤں کے انٹرویوز میں بہت سے ایسے مسائل سامنے آئے، جن میں سے زیادہ تر میں ریاست اور معاشرے کی کارگزاری پر انگلی اٹھائی گئی تھی۔

ان انٹرویوز کی بنیاد پر، ہم نے تین اہم نتائج اخذ کئے ہیں۔

انتہا پسندی کے اسباب

ہمارے ملک میں بے انتہا مدارس کام کر رہے ہیں اور ان میں سے بہت سے مدارس ایسے ہیں جو کسی نا کسی مکتبہ فکر کے حامی ہیں، یہ ہی وجہ ہے کہ ان میں سے چند مدارس میں دوسرے فرقوں سے نفرت کرنے کو بھی پروان چڑھایا جاتا ہے۔ ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ مدارس میں ان بچوں کو داخل کروایا جاتا ہے جو پڑھائی میں اچھے نہیں ہوتے جبکہ اس بات میں حقیقت نہیں کیونکہ جس مقدس کتاب کو حفظ کرنے کے لیے بچوں کو مدارس میں ڈالا جاتا ہے اس کے پڑھنے سے ذہن روشن ہو جاتا ہے اور اچھائی اور برائی کی پہچان ہوتی ہے، لیکن مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب جعلی ملاں اس مقدس کتاب کی تشریح

اپنے نظریے کے مطابق کرتے ہیں اور نوجوانوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسا ہوتا آیا ہے کہ طالبان یا مذہبی درس گاہوں کے طلباء اے ٹی ایم کارڈز کی طرح استعمال ہوتے رہے ہیں، جنہیں صرف وہی کیش کرسکتا ہے وہ جس کی ملکیت ہو جاتے ہیں اور یہ وہ ہی لوگ ہیں جو ہمارے نوجوانوں کو اپنے مقاصد کے لیے اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں۔ یہ اے ٹی ایم کارڈ محض پاکستان میں ہی استعمال نہیں ہو رہے بلکہ یہ کوئی بھی ایسا ملک استعمال کرسکتا ہے جو تنازعے کا حصہ ہو۔ مذہبی درس گاہ کے طلباء کو خصوصی مقصد کے تحت تربیت دی گئی۔ ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا گیا اور انہیں اہم عسکری اثاثے کے طور پر رکھا گیا، البتہ وہ اپنی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں ہیں۔ صرف انہیں استعمال کرنے والے جانتے ہیں کہ کسی پر اکسی جنگ میں وہ بیش قیمت ہیں اور ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

کراچی رقبے اور آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا شہر تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نسلی، لسانی اور سیاسی تشدد کا ٹھکانہ بن چکا ہے۔ دیہاتی یا قبائلی تشدد کی نسبت شہری تشدد زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیوں کہ شہری مراکز میں تعلیم یافتہ نوجوان اس میں ملوث ہوتے ہیں۔ جتنا کوئی مجرم تعلیم یافتہ اور ذہین ہوگا اس کو پکڑنا اتنا ہی مشکل ہوگا، یہ ہی وجہ ہے کہ کالعدم تنظیمیں اپنے نوجوانوں کی تعلیم اور کیئریر کونسلنگ پر بھی نہایت توجہ دیتی ہیں۔ انہوں نے نا صرف اپنے اسکول سسٹم بنائے ہوئے ہیں بلکہ باقاعدہ اعلیٰ نصاب بھی ان اسکولوں میں متعارف کروایا ہے۔ اس طریقے سے یہ دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنا نقطہ نظر نوجوانوں میں منتقل کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کراچی میں جہاں ہر رنگ و نسل کے لوگ رہتے ہیں وہاں تشدد کی صورتحال نہایت افسوسناک ہے۔ کبھی کہیں نوجوان تشدد کا ارتکاب کرتے دیکھائی دیتے ہیں اور کہیں نوجوان ان کا شکار ہوتے دیکھائی دیتے ہیں۔ الطاف حسین کے زیر اہتمام متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) میں تمام حلقوں سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہے، جس میں یونیورسٹی اساتذہ، انجینئرز، ڈاکٹرز، کاروباری افراد اور سیاسی و سماجی طور پر سرگرم افراد شامل ہیں۔ وہ اپنی حکمت عملی میں سیکولر ہیں، لیکن سیاسی تنظیم ہونے کے ناطے سے پرتشدد ہیں۔ اسی طرح ایک نہایت اہم سیاسی جماعت پیپلز پارٹی کا ایک گروہ جو کہ اب ان سے الگ ہو گیا ہے

اور پیپلز امن کمیٹی کے نام سے جانا جاتا ہے جو کہ ایک سیاسی جماعت ہے اور کراچی کے علاقے لیاری میں ان کا اثر ورسوخ ہے اس کو بھی ۲۰۱۱ء میں کالعدم کرار دے دیا گیا تھا۔

پولیس بھی نوجوانوں سے سچ اگلوانے کی خاطر نئے طریقوں کا استعمال کرتی تھی۔ لیکن جب مجرم جسمانی اور ذہنی تشدد کے حربے استعمال کرتے ہیں، تو ان کے ہاتھوں، کلائیوں، ٹانگوں، پاؤں اور یہاں تک سر میں ڈرل سے گہرے سوراخ کر دیتے ہیں۔ وہ تمام اقسام کے جسمانی اور ذہنی تشدد کے طریقے استعمال کرتے ہیں کیوں کہ وہ خود اس طرح کی مصیبتوں سے گزر چکے ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۴ میں، چند مجرموں نے علی گڑھ کالونی، کراچی میں عورتوں پر تیزاب پھینکا تھا جس نے اس بڑے شہر میں نسلی تشدد کو ہوا دی تھی۔ نسلی تشدد نے ملک کے شہری سیاسی منظر کو تقسیم کر دیا ہے۔ سیاسی اور مذہبی انتہا پسند شہر کے آقا ہیں۔ وہ لوگوں کو ہراساں کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں، انہیں اغوا کر لیتے ہیں، زنا بالجبر کے مرتکب ہوتے ہیں اور ان سے بھتہ وصول کرتے ہیں۔

جب بھی کوئی افسوسناک واقعہ رونما ہوتا ہے تو یہ ہی کہا جاتا ہے کہ ہماری حکومت اس مسئلہ کی جانب توجہ نہیں دے رہی، بلاشبہ جس قدر یہ سنگین مسئلہ ہے اس کے سدِ باب کے لیے کوششیں نہیں کی گئیں۔ سابق صدر پرویز مشرف نے کہا تھا کہ پاکستان میں بہت سی ایسی تنظیمیں کام کر رہی ہیں جس سے ملک کو خطرہ ہے اور اسی دور میں بہت سی تنظیموں کو کالعدم بھی قرار دیا گیا، لیکن پھر بھی یہ تنظیمیں نام تبدیل کر کے اپنی سرگرمیاں جاری رکھتی رہیں۔ دوسری جانب ٹاک شوز میں ان کالعدم تنظیموں کے لیڈروں کو دعوت دی جاتی رہی یا ان کی رائے بذریعہ ٹیلی فون لی جاتی رہی۔ اس سے عام عوام آگاہ نہیں ہے کہ وہ کالعدم تنظیم کا حصہ ہیں، غیر مسلم ممالک سے نفرت اور ان کے شعلہ بیان الفاظ جذباتی نوجوانوں کو ان کی طرف مائل کرنے میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ ایک اور اہم نقطہ یہ بھی رہا ہے کہ پاکستان بھر میں کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیمیں جو پاکستان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر رہی ہیں اور نوجوانوں کو امن کے فروغ کا پیغام دیتی ہیں ان کو بدنام کیا گیا ہے لیکن کالعدم ادارے بہت آرام سے کام کر رہے ہیں بلکہ لٹریچر، میڈیا ونگ، کیریئر کونسلنگ، شادی کے دفاتر، فلاح و بہبود کے کاموں کے

ساتھ ساتھ اسکول بھی چلا رہے ہیں، ان کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے اس پر کوئی بات نہیں کرتا نا ہی کوئی ان کی سرگرمیوں سے پردہ اٹھاتا ہے لیکن اب یہ وقت کی ضرورت ہے کہ عوام کو آگاہ کیا جائے کہ ایسے ادارے جو کالعدم ہیں وہ کہاں اور کیسے کام کر رہے ہیں۔ پشاور کے سانحے کے بعد حکومتی سطح پر اقدامات کیے جا رہے ہیں امید ہے کہ ہم دہشتگردی کی لعنت سے جلد چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔

دہشت گرد کا آغاز

عابد سلام عرف لڈن بھائی لیاقت آباد میں رہتا تھا اور دہاڑی پر مزدوری کرتا تھا۔ وہ سہراب گوٹھ کے قریب ایک چھوٹی سی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ ایک روز ایک سوزوکی کار میں سوار کم عمر لڑکوں کے ایک گینگ نے لیاقت آباد نمبر سات میں ایک درزی کی دوکان پر دھاوا بول دیا۔ انہوں نے اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے نوجوان درزی کو گولیوں سے چھلنی کر دیا اور اسے مار دینے کے بعد وہ فرار ہو گئے۔ مقامی پولیس موقعہ پر پہنچی اور لڈن بھائی سمیت کچھ لوگوں کو پکڑ لیا۔ بعد ازاں، پولیس نے اسے قتل کے کیس میں ملوث کر دیا۔

چھ ماہ بعد، لڈن بھائی کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ اس کے دوست اور مقامی دوکاندار اس کے گھر آئے اور ایک نسل پرست پارٹی کی حمایت حاصل کرنے پر اسے مبارک باد دی۔ جب کبھی وہ کسی کو قریبی ہوٹل میں چائے یا کھانے کے لئے لے کر جاتا تھا، تو ہوٹل کا مالک شفیع بھائی اس سے پیسے نہیں لیتا تھا۔ اسی طرح، پان کی دوکان کا مالک، اسے ہر چیز مفت فراہم کرتا تھا۔ وہ فخریہ کہتے تھے، ''ہمیں لڈن بھائی پر فخر ہے۔ وہ ہمارے لئے اور ہمارے کاروبار کے لئے ایک ڈھال ہے۔'' جب کبھی وہ مارکیٹ سے گزرتا تھا، دوکاندار اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ خوف سے بھرے اس احترام نے جو مقامی لوگ اسے دیتے تھے، اس کی حالت ہی بدل دی۔ لڈن نے صوبائی اسمبلی کی سیٹ پر انتخاب میں حصہ لیا۔ اس نے ایک مذہبی پارٹی سے تعلق رکھنے والے اپنے مخالف امیدوار کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔

ایک روز، جب وہ پارٹی سیکریٹریٹ کے نزدیک ایک جلسہ عام کے لئے لوگوں کو لے کر جا رہا تھا، تو ایک نوجوان لڑکے نے جو مخالف امیدوار کا بیٹا تھا، اس کے سر میں چھ گولیاں اتار دیں۔ لڈن بھائی نے موقعہ پر ہی دم توڑ دیا۔ اس کے چاہنے والے اور اس کے ماننے والے منظر سے غائب ہو گئے۔ صرف اس کی ماں، ملکہ بی بی، اس کی لاش پر بین کر رہی تھی۔ اگلی صبح، اسے پارٹی کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ ملکہ بی بی نے ایک مرتبہ اپنے بیٹے کی قد آدم رنگین تصویر سڑک کے کنارے جنگلے پر لٹکائی ہوئی دیکھی۔ اس نے شکایت کی کہ سیاسی نفرت نے اس سے اس کا بیٹا چھین لیا۔ لیکن کیا یہ محض سیاسی نفرت تھی؟ اگر ہاں تو کیا وہ بھی اس کام میں شامل نہیں تھا؟ کیا اس نے ماؤں کے کلیجے کی ٹھنڈک اور بہنوں کے سہارے نہیں اجاڑے تھے؟ وہ بھی اسی موت مرا جس طرح وہ لوگوں کو اذیت دیتا تھا۔ جس طرح اس کے شکار کی مائیں بین کرتی تھیں اسکی ماں بھی اسی طرح بین کر رہی تھی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اسکی ماں اس کے کاموں سے بے خبر تھی اس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا بیٹا ایک ظالم اور سفاک انسان ہے، اگر اس کو یقین ہوتا تو وہ کسی نا کسی طرح اپنی اولاد کو اس جرم اور سفاکی کی زندگی سے دور لے جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا یہ ہی حال ہمارے ملک کی بے شمار ماؤں کا ہے جن کو اپنے بچوں کی سرگرمیوں کی خبر نہیں ہوتی لیکن پھر ان کو اس کو انجام بھگتنا پڑتا ہے۔ وہ نوجوان جو جیتے جی اپنی ماؤں کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے کیا وہ اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کے کسی ایسے واقعے میں ملوث ہونے اور پھر مرنے کے بعد ان کی مائیں کس قرب سے گزرتی ہیں۔

یہ دوسری کہانی منظور احمد کی ہے جو کہ مطلقہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اپنے باپ کی دوسری شادی کے مخالف تھا۔ باپ کے ساتھ اس کی نفرت کے باوجود، وہ اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس کی ماں ایک دور دراز گاؤں میں اپنے والدین کے ہمراہ رہتی تھی۔ اس کی ماں ہمیشہ اس سے کہتی تھی کہ وہ اسلامی تعلیمات سیکھے اور ایک اچھا مسلمان بن جائے۔ ایک روز اس نے خاموشی سے گھر چھوڑ دیا اور مظفر آباد میں ایک جہادی گروپ میں شمولیت اختیار کر لی۔ ہماری کم علمی اکثر ہمیں ایسے جعلی ملاؤں کے پاس لے جاتی ہے جو ہمیں علم تو نہیں دے سکتے لیکن ہمیں اسلام کے نام پر استعمال کرتے ہیں، وہ نوجوانوں کو اپنے

نقطہ نظر کے مطابق تعلیم دیتے ہیں اور نسلی، لسانی اور فرقہ وارانہ تعصب پر اکساتے ہیں۔ منظور کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا وہ ایک جہادی تنظیم کے ساتھ کام کرنے لگا تھا، اور ان کے ہاتھوں استعمال ہونے لگا۔

کوئی نہیں جانتا کہ اس نے تربیت کے دوران اپنے دن کس طرح گزارے۔ ایک روز اسی جہادی تنظیم کے ایک نوجوان نے اسلام آباد میں کام کرنے والے اس کے کزن رشید کو اطلاع دی کہ منظور نے بھارتی مقبوضہ کشمیر کے ایک گاؤں میں ''جام شہادت'' نوش کر لیا ہے۔ تین روز کے بعد ایک مذہبی پارٹی کا سربراہ اس کی رہائش گاہ پر پہنچا اور اس کے باپ کو اس کے بیٹے کی ''شہادت'' پر مبارک باد پیش کی۔ متوفی (منظور) کی ماں اس کی آخری رسوم میں شرکت کے لئے نہیں آئی۔ وہ اپنے بیٹے کو خدا حافظ نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ اب بھی اسی اذیت کا شکار ہے۔ اس کا باپ جس کا سہارا اسکی دوسری بیوی اور باقی بچے تو ہیں لیکن اسکی ماں اس کا غم سینے میں چھپائے اور خون کے آنسو پیتی زندگی گزار رہی ہے۔

مذہبی دہشت گردوں کا اثر و رسوخ

بری صحبت

حلیمہ بی بی یہ سمجھتی ہے کہ اس کا ۳۰ سالہ بیٹا مبارک سولنگی، اُن انتہا پسندوں کا شکار بنا جو اُس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ وہ اس انٹرویو کے وقت گزشتہ تین ماہ سے غائب تھا۔ دیگر ذرائع سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق قانون نافذ کرنے والے اداروں نے اسے اسلحہ اور گولہ بارود سے لیس، پشاور میں گرفتار کر لیا تھا۔ وہ اس وقت جیل میں سزا کاٹ رہا ہے جب کہ خاندان کے لوگ اس حقیقت سے نا آشنا ہیں اور ان کا اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ حلیمہ جانتی تھی کہ سولنگی اکثر انتہا پسند ملاؤں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ پڑوسی اسے مسلسل خبردار کرتے رہتے تھے کہ سولنگی کو مشتبہ لوگوں کے ساتھ دیکھا گیا تھا، لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اس معاملے پر اس سے جھگڑا بھی کیا لیکن وہ اسے چکر دے دیتا تھا اور یقین دلاتا تھا کہ وہ درست راستے پر ہے۔ حلیمہ کے مطابق، ''کچھ لوگ اپنی ماؤں کی بات سنتے ہیں جب کہ دیگر لوگ اپنے دوستوں کی بات پر دھیان دیتے ہیں۔ شروع شروع میں میرا بیٹا بڑا فرمانبردار تھا، لیکن

اس کے دوستوں کے حلقہ کا اثر ورسوخ بڑھنے کے بعد، اس نے میری بات پر دھیان دینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ مذہبی اعمال میں بہت سخت تھا، اور اس نے شہر سے باہر اور ملک سے باہر مذہبی تبلیغ میں بھی حصہ لیا تھا۔ کوئٹہ منتقل ہوجانے کے بعد، اس نے اپنے خاندان کے ساتھ ہر قسم کا ناطہ توڑ لیا تھا۔ سولنگی کے غائب ہوجانے کے بعد، اس کے خاندان نے اسے ہر جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جب پوچھا گیا کہ کیا کبھی کسی ادارے نے ان سے ان کے بیٹے کے بارے میں تفتیش کرنے کے لیے رابطہ کیا ہے تو انہوں نے کہا" کسی سیکورٹی ادارے نے تفتیش یا معلومات کا تبادلہ کرنے کے لئے کبھی رابطہ نہیں کیا"۔ البتہ حلیمہ حقیقت پسند خاتون ہے اسے اس راستے کا اندازہ ہے جو اس کے بیٹے نے چن لیا تھا۔ وہ ایسی انتہا پسند تنظیموں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ معصوم لوگوں کی زندگی تباہ کرنا چھوڑ دیں اور اپنے آپ کو اس مذہب کے مطابق ڈھال لیں جس پر قائم رہنے کا وہ دعویٰ کرتے ہیں۔

جو لوگ انتہا پسند تنظیموں میں شمولیت اختیار کرتے ہیں ہمارا ان سے ایک سوال ہے، کیا ماں کی فرمابرداری کرنا مبارک کا فرض نہیں بنتا تھا؟ اسکی ماں اس کو کسی شرعی کام سے منع تو نہیں کر رہی تھی ناں ہی غیر اسلامی قاعدوضوابط کے مطابق زندگی گزارنے کا کہہ رہی تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ماں کی نافرمانی اور برے لوگوں کی صحبت نے اس کو اس دوراہے پر لا کھڑا کیا جہاں سے نا ہی واپسی کا کوئی راستہ ہے اور آگے دیکھے تو بس ایک کھائی ہے۔ جب مذہب کی بات کی جاتی ہے تو ہم مذہبی طور پر نہایت حساس اور جذباتی ہیں، ہماری اسی جذباتیات کا فائدہ جعلی ملاں اٹھاتے ہیں اور ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مزید برآں، ملک میں، خصوصاً دیہی علاقوں میں، تعلیمی اداروں کی کمی کے وجہ سے زیادہ تر والدین اپنے بچوں کو مدارس میں بھیجنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ مدارس مذہبی تعلیم فراہم کرتے ہیں، لیکن نظامِ تعلیم کی مانیٹرنگ نا ہونے کی وجہ سے بہت سی مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ کچھ ایسے مدارس بھی ہیں جہاں اساتذہ اپنی تشریح کے مطابق اسلام کی تعلیم دیتے ہیں۔ چونکہ اُن کی اپنی تشریح متشدد ہوسکتی ہے، اسی وجہ سے کچھ عرصے سے مدارس کے چھان بین کی جارہی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمام مدارس ایسا نہیں کرتے، البتہ سابق روس اور امریکہ کے درمیان سرد جنگ کے آغاز ہیں اور ۲۰۰۱ء

میں نائن الیون کے حالیہ واقعات کے بعد سے، کچھ مدارس نے اپنی پوری توجہ ''جہاد'' کے تصور پر صرف کرنی شروع کر دی ہے، اور یہ ملک میں بڑھتی ہوئی شورش کی ایک بڑی وجہ ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ زیادہ تر ماؤں کا یہ ماننا ہے کہ ان کے بیٹے مذہب اور ملک کی برتری کے لئے لڑتے رہے ہیں۔ افغانستان اس سلسلے میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے، اور جیسا کہ چند عسکریت پسندوں نے ہمیں بتایا ہے کہ ''نیٹو کی شکل میں تمام غیر مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔'' گزشتہ کئی برسوں کے دوران، شاید ۱۹۸۰ء کی دہائی سے، پاکستانی معاشرہ طرز زندگی، سوچ اور ذہنیت کے حوالے سے عسکریت پسندی کا زیادہ شکار ہو چکا ہے۔ نا صرف چند مدرسوں بلکہ مذہب کا نام استعمال کرتے ہوئے، بہت سے انتہا پسند افراد کمزور گروہوں کو ذہنی طور پر تبدیل کر رہے ہیں۔

۳۰ سالہ مبارک سولنگی بھی اس کی ماں کے مطابق ایسی ہی تبدیلی کا شکار ہوا۔ سولنگی اکثر علاقے کے ملاؤں سے ملنے جایا کرتا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ، ان ملاقاتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مبارک کی ماں پہلی ہی یہ نشان دہی کر چکی تھی کہ وہ مُلا جن کے ساتھ اس کا بیٹا اٹھتا بیٹھتا تھا، وہ ''جھوٹے ملا'' تھے اور ان کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اِن ملاؤں کا اپنے بیٹے پر منفی اثر محسوس کر سکتی تھی، اور اسی لئے اس نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ تاہم، سولنگی نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا اور آخر کار اس کا انجام پایا، دہشت گردی کی سرگرمیوں کے شبے میں اسے سیکورٹی اداروں والے لے گئے اور وہ ابھی تک جیل میں اپنا وقت گزار رہا ہے۔ اس کی ماں، دیگر ماؤں کی طرح، اپنے بیٹے کی حرکتوں سے انکاری نہیں ہے، لیکن یہ یقین رکھتی ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اسے دہشت گرد سرگرمیوں کا ارتکاب کرنے پر اکسایا تھا انہیں سزا ضرور ملنی چاہیئے۔

مذہبی ہونے کا جرم یا کچھ اور۔۔۔؟

عزت خاتون ایک مذہبی درس گاہ میں اپنے پانچ بیٹوں کے ساتھ رہتی ہے۔اس کے بیٹوں میں سے ایک، عطااللہ ہے جو انٹرویو کے وقت گزشتہ نو ماہ سے غائب تھا۔عطااللہ شادی شدہ تھا اور اس کے ہاں اس کی گمشدگی کے پانچ روز بعد بیٹا پیدا ہوا تھا۔اس کی ماں کے مطابق، عطااللہ زیادہ تر درس گاہ ہی میں رہتا تھا اور صرف ایک بار ۴۰ روز کے لئے مذہبی تبلیغ کے لئے باہر گیا تھا۔ وہ درس گاہ میں نماز بھی پڑھایا کرتا تھا۔ یہ شام کا واقع ہے، جب سادہ کپڑوں میں ملبوس کچھ لوگ بغیر نمبر پلیٹ کی پولیس کی گاڑیوں میں آئے اور عطااللہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ایک طالب علم نے عزت خاتون کو اس واقعے کی اطلاع دی، جب کہ آس پڑوس کے لوگوں نے بھی اس واقعے پر تشویش کا اظہار کیا۔ان لوگوں نے طالب علم سے ملاقات کی اور عطااللہ کے بارے میں پوچھا۔ان لوگوں نے اسے کہا کہ عطااللہ کو بتاؤ کہ اس کے کچھ دوست اسے ملنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ان سے ملنے کے بعد، عطااللہ ان کی کار میں بیٹھ گیا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔اس کی ماں کو یقین ہے کہ اس کا بیٹا بے گناہ ہے اور پاکستان میں تشدد کی حالیہ صورتحال کے بارے میں وہ کہتی ہے، ''کوئی نہیں جانتا کہ کون ان واقعات کے پیچھے ہے۔ یہ مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اور شیعہ بھی۔'' اس ماں کے اس جملے نے مجھے ایک لمحے کے لیے جھنجھوڑ کے رکھ دیا، کیا یہ اس ماں کی تربیت تھی جو وہ کسی ایک فرقے سے نفرت کا اظہار کر رہی ہیں یا یہ ان بچوں کے ساتھ رہنے کا اثر و رسوخ تھا جو ماں کے الفاظ سے عیاں ہو رہا تھا۔مزید انہوں نے کہا کہ ان کے پاس کوئی رقم نہیں ہے، اس لئے وہ کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنے سے بھی قاصر ہیں۔درس گاہ کا انچارج تقریباً ۸۰۰۰ روپے ان کے خاندان کو دیتا ہے۔عزت کے مطابق، کوئی تنظیم انکی مدد کے لئے آگے نہیں آئی۔اب تک ان کا خاندان عطااللہ کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا، جب کہ وہ پولیس اور عدالتوں سے بھی رابطہ کر چکے ہیں۔ پولیس نے شروع میں ابتدائی معلوماتی رپورٹ (ایف آئی آر)

درج کرنے سے انکار کر دیا تھا ، لیکن ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے احکامات کے بعد گمشدہ فرد کے کیس کی ایف آئی آر درج کر لی گئی۔ تاہم، اب تک اس کیس میں کوئی پیش رفت سامنے نہیں آئی۔

دوسری جانب، کچھ ماؤں کی یہ رائے بھی تھی کہ کیوں کہ ان کے بیٹوں کا مذہب سے قریبی لگاؤ تھا، اس لئے ایجنسیوں نے انہیں محض اس بنیاد پر اٹھا لیا تھا اور یہ کہ ان کے بچے کسی وحشیانہ یا دہشت گردی جیسے جرائم میں ملوث نہ تھے۔ مذہب کے ساتھ ان کی قربت نے شک کی بنیاد فراہم کی جس پر انہیں اٹھا لیا گیا یا جیل میں ڈال دیا گیا۔ یہ واقعی ایک بہت بڑی دریافت تھی۔ ہر مذہب اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اس کے ساتھ منسلک رہیں۔ پاکستان جیسے ملک میں، جو مرد/عورت اپنے مذہب سے قریب ہوتا/ ہوتی ہے اسے متقی تصور کیا جاتا ہے لیکن گزشتہ چند عشروں میں دہشت گردی اور اسلام کے درمیان غلط فہمی کے پیدا ہو جانے والے تعلق کی وجہ سے، بدقسمتی سے ایسے افراد کو کبھی کبھار شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے جو بلا شبہ متقی اور پرہیز گار لوگ ہیں۔

عزت خاتون کا بیٹا، عطا اللہ، بھی اس کی ماں کے مطابق ایک ایسا ہی ''متاثرہ فرد'' ہے۔ عزت کے مطابق، عطا اللہ کا مذہب کے ساتھ قریبی لگاؤ اور اس کی مذہبی سرگرمیاں سیکورٹی اداروں کی جانب سے اس کی گرفتاری کی وجہ بنی ہیں۔ ایک روز جب عطا اللہ درس گاہ میں موجود تھا، اسے علاقے میں دہشت گرد سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے شبہ میں پولیس نے اٹھا لیا تھا۔ جب یہ خبر عزت تک پہنچی تو وہ، اپنے پڑوسیوں کے ہمراہ، قریبی تھانے جا پہنچی۔ تاہم، وہ اسے تلاش نہ کر پائی۔ اس وقت سے اب تک وہ بہت سے تھانوں کے چکر لگا چکی ہے اور یہاں تک کہ اس نے اپنے بیٹے کی گمشدگی کی ایف آئی آر بھی درج کروا دی ہے لیکن اس کے باوجود اس کا کوئی اتہ پتہ نہیں ۔ جس طرح عزت خاتون یہ سمجھتی ہیں کہ ان کا بیٹا بے گناہ ہے اور محض مذہبی ہونے کی سزا کاٹ رہا ہے اسی طرح کی بے شمار ماؤں سے ملاقات ہوئی ان کے خیالات کیا ہیں آئے جانتے ہیں:

فاطمہ ایک ایسی ماں ہے جس کے سولہ سالہ بیٹے رحیم اللہ کو دس سال پہلے سیکورٹی اداروں نے دہشت گرد ہونے کے شبہ میں اٹھا لیا تھا۔ اس کی ماں کے مطابق، رحیم اللہ کا واحد قصور ''مذہب سے قریبی

لگاؤ'' تھا۔ ایک روز جب رحیم اللہ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا، تو اسے پولیس پکڑ کر لے گئی اور اس دن سے اب تک وہ قید کی سزا بھگت رہا ہے۔ فاطمہ کے مطابق، جب پولیس نے کسی قسم کے ہتھیاروں یا رحیم اللہ کے دہشت گرد ہونے سے متعلق کسی ثبوت کی تلاش میں اس کے گھر پر چھاپہ مارا، تو وہ ایسا کوئی ثبوت تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اس کے باوجود، انہوں نے رحیم اللہ کو رہا نہیں کیا۔ فاطمہ کو اپنے بیٹے کی رہائی کے لئے کوشش کرتے ہوئے اب ایک عشرہ بیت چکا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "ریاست اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی اہلیت میں کمی نے بھی رحیم اللہ کو اس کی ماں سے دور رکھنے میں ایک کردار ادا کیا"۔

مریم بی بی بھی ایسا ہی سوچتی ہے کہ اس کا بیٹا مذہبی ہونے کے جرم میں سزا کاٹ رہا ہے۔ اس کا بیٹا جہانگیر دہشت گرد سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے شبہ میں اس وقت جیل میں بند ہے۔ جہانگیر کو پولیس نے ایک مذہبی جلسے یا ''اجتماع'' کے دوران اٹھا لیا تھا۔ ہماری تحقیق یہ انکشاف کرتی ہے کہ جہانگیر ایک مذہبی گروپ کا سرگرم کارکن تھا اور حکومت مخالف احتجاجوں میں ملوث تھا۔ تاہم، اس کی ماں کے مطابق وہ صرف مذہبی سرگرمیوں میں ملوث تھا۔

صادقہ بیگم اس بات پر قائم ہے کہ شوکت کسی بھی گروپ کے ساتھ منسلک نہیں ہے۔ اُس کا یہ ماننا ہے کہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو اسے ضرور معلوم ہوتی۔ پولیس اسے بتاتی ہے کہ ''اماں، تم کچھ نہیں جانتیں.....'' لیکن وہ ان کی بات کا یقین کرنے سے انکار کرتی ہے۔

قصوروار؟

کراچی کی رہائشی، فاطمہ، اپنے بیٹے رحیم اللہ کی رہائی کے حصول کے لئے گزشتہ دس برسوں سے عدالتوں کے چکر لگا رہی ہے۔ جب پولیس نے اسے گرفتار کیا تو اس کی عمر سولہ برس تھی اور اس پر دہشت گردی کے ۷ اکیسز قائم کئے گئے۔ جب اس کو اٹھایا گیا اس وقت وہ آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا، ایک دوکان پر کام کرتا تھا اور مذہبی تعلیم کے لئے ایک قریبی درس گاہ بھی جاتا تھا۔ رحیم اللہ کو پولیس

نے مسجد سے گرفتار کیا تھا جب کہ اس کے خاندان والے اس واقعے سے باخبر نہیں تھے۔ اس کی گمشدگی کے دو روز بعد خاندان نے اس کی گمشدگی کے حوالے سے حکام کو ایک درخواست تحریر کی۔ جواب میں انہیں قریبی تھانے سے رابطہ کرنے کا کہا گیا۔ پولیس بھی ان کے گھر پر آئی اور رحیم اللہ کے بارے میں دریافت کیا۔ فاطمہ کے مطابق، پولیس نے اسے اس غلط تصور کے تحت گرفتار کیا تھا کہ وہ عمر میں کہیں بڑا ہے۔ جب پولیس ان کے گھر آئی تھی تو ان کا خیال تھا کہ اس کے سب سے بڑے بیٹے کا ۱۷ سالہ بیٹا، رحیم اللہ کا بیٹا تھا۔ وہ یہ دعویٰ بھی کرتی ہے کہ جب پولیس گھر کا معائنہ کرنے اور تلاشی لینے میں مصروف تھی، تو وہ کہہ رہے تھے کہ ''ان لوگوں کے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔''

فاطمہ اپنے بیٹے سے ملاقات کرنے تھانے بھی گئی تھی، جہاں اس کے مطابق، پولیس نے اس پر تشدد نہ کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس نے پولیس کے ساتھ منہ ماری بھی کی تھی اور تحقیق کرنے پر اس کے بیٹے رحیم اللہ نے ہچکچاتے ہوئے پولیس کے دعوے سے اتفاق کیا تھا۔ فاطمہ نے اپنی بہو کے زیور بیچ کر ایک وکیل کیا تھا، جو بعد ازاں قتل کر دیا گیا۔ مالی پریشانی کے باعث رحیم اللہ کی وکالت سرکاری وکیل کر رہے ہیں جن کی اس کیس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حالانکہ اسے کچھ کیسوں میں بے گناہ قرار دے دیا گیا ہے، دیگر کیس ابھی باقی ہیں اور اس کی رہائی میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ وہ یہ دعویٰ بھی کرتی ہے کہ پولیس دو مرتبہ اس کے گھر آئی اور اس کے بیٹے کو آزاد کرنے کے بدلے ایک لاکھ روپے کی رقم کا مطالبہ کیا۔ وہ انہیں اتنی بڑی رقم ادا نہیں کر سکتی تھی، لہٰذا اس نے انکار کر دیا۔ فاطمہ یہ سمجھتی ہے کہ انصاف کے نظام میں سقم ہے اور زیادہ تر بے گناہ لوگ سلاخوں کے پیچھے ہیں جب کہ جرائم کا ارتکاب کرنے والے آزاد گھوم رہے ہیں۔ مزید، اس کی رائے میں پاکستان دہشت گردی کے ناسور سے دوچار ہے، وہ یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ غیر مسلم اصل دشمن ہیں اور انہیں ہدف بنانا چاہیئے۔

اس انٹرویو کو سامنے رکھتے ہوئے بہت سے سوالات جنم لیتے ہیں پہلی بات یہ کہ ہمیں قانون نافذ کرنے والے اداروں اور انصاف فراہم کرنے والے اداروں پر اعتبار نہیں رہا، دوسری بات یہ کہ ان ہی اداروں میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی وجہ سے پورا محکمہ بدنام ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ نا جانے اس

ماں سے پیسے مانگنے والے واقعی قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کالی بھیڑیں ہیں یا کوئی اور اس موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے؟ اور پھر اس ماں کی سب سے آخر میں کہی گئی بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے ملک میں تشدد انتشار اور دہشتگردی کی صورتحال کو اب تک ہم غیر ملکی سازش ہی سمجھتے رہے ہیں آخر کب ہم اپنے گریبان میں جھانکیں گے؟ آخر کب ہمیں یہ احساس ہوگا کہ ہمارے ہی بچے ہمارے ہی اپنے غلط لوگوں کے ہاتھوں استعمال ہو کر گھناؤنے کام کرنے لگے ہیں؟

شہریوں کی حکومت پر بے اعتمادی

متاثرہ ماؤں کی فریاد

پاکستان میں عامرانہ حکومتوں اور نااہل سیاسی ڈھانچوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی لاقانونیت، بدعنوانی، عدم احتسابی، انفراسٹرکچر کی کمی اور سرکاری محکموں کی جانب سے خدمات کی عدم دستیابی پر سیر حاصل بحث ہوتی رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں، ریاست کی کارکردگی کے بارے میں شہریوں کا عام تاثر انتہائی منفی ہو چکا ہے۔ عوام قوانین اور ملک کے قانون سازوں پر اپنا اعتماد کھو چکی ہے۔ قانون کو اکثر الزام دیا جاتا ہے کہ یہ شہریوں کو انصاف فراہم نہیں کر رہا۔ دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والوں اور اس کے متاثرین دونوں طرح کے افراد کی ماؤں کو یقین ہے کہ ملک کے قانونی نظام میں 'قانون کی حکمرانی اور انصاف تک رسائی' کے نفاذ کی کمی ہے۔ متاثرین کی مائیں اس بات پر قائم تھیں کہ قانون ان کے پیاروں کو، جو دہشت گردی کے نتیجے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، کوئی بھی تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ مزید برآں، ریاست دہشت گردی کا شکار ہونے والوں کے خاندانوں کو اکثر مواقع پر کوئی بھی مالی امداد فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ فوجداری نظام انصاف بھی دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والوں کو پکڑنے اور سزا دینے میں ناکام رہا ہے۔

ایک بدنصیب ماں، نسیم، جس کے گیارہ سالہ بیٹے نے ۲۰۱۳ء کے ایک بم دھماکے میں اپنی

جان گنوادی تھی، اسی قسم کی صورت حال کا شکار ہے۔ حالانکہ حکومت نے امداد کے طور پر پندرہ لاکھ روپے کی رقم ادا کردی ہے، نسیم پھر بھی یہ محسوس کرتی ہے کہ حکومت نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ حکومت نے دہشت گردی کے ان واقعات کو روکنے کے لئے جن میں تقریباً روزمرہ کی بنیاد پر معصوم لوگوں کی جانیں ضائع ہورہی ہیں کافی اقدامات نہیں کئے ہیں۔ مزید برآں، وہ یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ حکومت اور قانون نافذ کرنے والے ادارے دونوں ہی ایسے واقعات کا ارتکاب کرنے والوں کو پکڑنے اور انہیں سزا دینے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔

لال بی بی ایک اور ایسی ماں ہے جو دہشت گردی کے مسئلے سے نمٹنے میں ریاست کی نااہلی کا شکار ہوئی ہے۔ اس کے بیٹے عثمان نے لیاری کے ایک بم دھماکے میں اس وقت اپنی جان دے دی تھی جب وہ ایک قریبی مارکیٹ میں سبزی خرید رہا تھا۔ پولیس نے لاش کی شناخت کے لئے خاندان کو مردہ خانے بھجوایا۔ لال بی بی سمجھتی ہے کہ نوجوانوں کے لئے ملازمت اور تعلیم کے مواقع کی کمی دہشت گردی اور تشدد کی وجہ ہیں۔ اس کی رائے میں حکومت یہ سہولتیں فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے لیکن ان معاملات کو حل کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتی۔

دہشت گردی کے شکار ایک اور نوجوان کی ماں، رئیس فاطمہ نے بھی اس المناک واقعے کو دہرایا جس نے اس کا بیٹا اس سے چھین لیا۔ اس کے مطابق، نہ صرف ریاست دہشت گردی کی سرگرمیوں کو روکنے میں ناکام ہوچکی ہے بلکہ متاثرین کے خاندانوں کو بھی کوئی امداد فراہم نہیں کی جارہی۔ اس نے اس المیہ کو دہراتے ہوئے کہا، ''جب یہ سانحہ پیش آیا، کوئی ریاستی ادارہ آگے نہیں آیا، بلکہ لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت امدادی کوششوں میں حصہ لیا۔''

وہ یہ سوچتی ہے کہ وہ لوگ جو حملے کرتے ہیں ان کی بحالی کے لئے اقدامات کئے جانے چاہئیں اور انہیں سزا دینے کی بجائے ان کی رہنمائی کی جانی چاہیئے کیوں کہ سزا اس لعنت کا صرف ایک مختصر المدت حل ہے۔ ذہنی طور پر وہ ابھی تک صدمے کی حالت میں ہے اور ہلکا سا بھی شور اسے خوف زدہ کردیتا ہے۔ آہوں کے درمیان وہ کہتی ہے، ''صرف ایک ماں ہی ایک نوجوان بیٹے کو کھودینے کے

درد کو سمجھ سکتی ہے''۔ وہ ایسے تشدد کا ارتکاب کرنے والوں کو شیطان کے ماننے والے اور غیر انسانی لوگ تصور کرتی ہے، لیکن وہ پھر بھی ان کے لئے دعا گو ہے کہ وہ راہ راست پر آجائیں۔ ''وہ اس سزا سے باخبر نہیں ہیں جو انہیں قیامت کے روز ملنے والی ہے۔ ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ہزاروں خاندانوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔ اس ملک میں کہیں کوئی امن نہیں ہے۔''

''بے حسی''

گیارہ سالہ باقر کی ماں سیدہ نسیم زہرہ ۳ مارچ ۲۰۱۳ء کو عباس ٹاؤن میں ہونے والے اس المناک سانحے کو یاد کرتی ہے جس نے دیگر ۴۷ افراد کے ساتھ اس کا بیٹا بھی چھین لیا تھا۔ باقر ایک کامیاب انسان بننا چاہتا تھا، تاکہ وہ نا صرف اپنے خاندان کے لئے کچھ کر سکے بلکہ اپنی ماں کو بھی ایک آرام دہ زندگی دینے کے قابل بن سکے۔ خاندان میں سب سے چھوٹا ہونے کے ناطے اس کے ساتھ سب سے زیادہ پیار کیا جاتا تھا۔ نسیم گھر کے پاس ہی کسی کے گھر گئی ہوئی تھی جب اس نے اپنے گھر کے آس پاس دھماکہ ہونے کی خبر سنی۔ وہ جلدی جلدی گھر پہنچی اور صرف باقر کی پریشان دادی اور بہن کو تشویشناک حالت میں پایا مگر اس کا بیٹا وہاں کہیں نہ تھا۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے باقر کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹہ گزر جانے کے بعد انہیں بتایا گیا کہ اس کے بیٹے کی دھماکے میں موت واقع ہو چکی ہے اور اس کی لاش قریبی اسپتال کے مردہ خانے میں موجود ہے۔ اس کے کھو جانے کا اثر اتنا شدید تھا کہ اس کی دادی نفسیاتی طور پر متاثر ہو گئیں۔ وہ یہ ماننے کے لئے تیار ہی نہ تھیں کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے اور ہر وقت باقر کو نام لے کر پکارتی رہتی تھیں۔ اس کی موت کے بعد اس کے اسکول میں بھی ایک بڑی دعائیہ تقریب منعقد ہوئی۔ حکومت نے غمزدہ خاندان کو پندرہ لاکھ روپے فراہم کئے۔ نسیم نے محسوس کیا کہ حکومت اور ریاست نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے، کیوں کہ اس نے محسوس کیا کہ حکومت نے ایسے سانحوں کو روکنے کے لئے مناسب اقدامات نہیں کئے اور وہ معصوم جانوں کے ضیاع سے قطعی طور پر لاتعلق ہے۔ اس نے کہا کہ ''انہیں چاہیئے کہ ایسے اقدامات کریں اور

اس بات کو یقینی بنائیں کہ آئندہ کوئی بھی دہشتگردی کے عمل کو دہرانے کی ہمت نہ کرے اور جو یہ کام کرتے ہیں انہیں عوام کے سامنے پھانسی دی جائے۔'' نسیم چاہتی ہے کہ متاثرین کے خاندان صبر کریں اور چاہتی ہے کہ دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والے یہ محسوس کریں کہ جن لوگوں کو وہ نشانہ بناتے ہیں وہ بھی انسان ہیں اور ان کا بھی کوئی خاندان ہے۔

مادرانہ مشورہ

رئیس فاطمہ کو تو اس کے بیٹے حسن علی کی لاش بھی نہیں دکھائی گئی تھی، جسے بم دھماکے کے تین روز بعد ملبے سے نکالا گیا تھا۔ اس کے بیٹے کو اس سانحے میں شدید زخم آئے تھے۔ اس کی عمر ۱۸ سال تھی اور وہ عباس ٹاؤن میں کاسمیٹکس کی ایک دوکان پر کام کرتا تھا۔ ایک بھی دن ایسا نہیں گزرتا جس روز اس کی ماں اس کے لئے نہ روتی ہو یا اس کی واپسی کی منتظر نہ ہو، باوجود اس کے کہ اسے معلوم ہے کہ وہ اب ان کے ساتھ نہیں رہا۔ وہ اسے ایک سخت محنتی اور فرمانبردار بچے کی حیثیت سے یاد کرتی ہے، جس نے اس کی توہین میں کبھی ایک لفظ تک نہیں کہا۔ ۳ مارچ ۲۰۱۳ء کو شام چھے بج کر تیس منٹ کا وقت تھا جب عباس ٹاؤن کی پوری آبادی ایک دھماکے سے ہل کر رہ گئی۔ فاطمہ کا شوہر اس کے جانب دوڑتا ہوا آیا اور اسے بتایا کہ باہر ایک دھماکہ ہوا ہے۔ وہ دونوں گھر سے باہر دوڑے اور پوری گلی کو خون میں لت پت پایا۔ دھماکے کی وجہ سے بجلی چلی گئی تھی اور اندھیرے میں مردہ لاشیں ہی پڑی ہوئی دیکھی جاسکتی تھیں۔ انہوں نے حسن کو تلاش کرنا شروع کیا لیکن اسے کہیں بھی ڈھونڈنے میں ناکام رہے۔ دوستوں اور پڑوسیوں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنے دل میں یہ جان چکی تھی کہ حسن علی نہیں بچا۔ تین دن گزرنے کے بعد انہیں ملبے سے لاش ملی اور اُس کی موت کی تصدیق ہوئی۔ نفسیاتی طور پر، وہ ابھی تک صدمے میں ہے اور ہلکے سے شور سے بھی خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ ایک آہ بھرتے ہوئے وہ کہتی ہے، ''ایک ماں ہی میرے درد کو سمجھ سکتی ہے کہ ایک ایسے نوجوان بیٹے کو کھونے کا درد کیا ہوتا ہے جس سے اس نے بے پناہ پیار کیا ہو۔''

ریاست اور مرتکب افراد کا کردار

دہشت گردی کے مرتکب ایک ملزم کی ماں ملک میں قانون کی حکمرانی پر سوال اٹھاتی ہے۔ بہت سے واقعات میں، لوگوں کو اٹھا لیا جاتا ہے اور یہاں تک کہ شبے کی بنیاد پر انہیں جیل بھی بھیج دیا جاتا ہے یا ماؤں کے مطابق، صرف جھوٹی معلومات پر ایسا کر دیا جاتا ہے۔ لمبی عدالتی کارروائیاں خاندانوں کی مصیبت میں صرف اضافہ ہی کرتی ہیں۔ ایک قانونی طریقہ کار موجود ہونے کے باوجود، بسا اوقات پولیس اور قانون نافذ کرنے والے ادارے آئینی قوانین سے انحراف کرتے ہیں۔ ان کو فراہم کی جانے والی معلومات کی بنیاد پر، ایجنسیاں بسا اوقات کسی سرکاری وارنٹ کے بغیر نا صرف لوگوں کی خلوت پر حملہ آور ہوتی ہیں، بلکہ ان کے گھروں پر چھاپہ بھی مارتی ہیں اور وہاں رہنے والوں کو ہراساں کرتی ہیں۔ ان ماؤں کی جانب سے بیان کی گئی کہانیوں کے تفصیلی حصے میں آپ کو بہت سی ایسی کہانیاں ملیں گی جن میں سیکورٹی اور قانون نافذ کرنے والے اداروں نے لوگوں کو بغیر کوئی وجہ بتائے اور ان کے خاندان کے علم میں لائے بغیر اٹھا لیا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ حالانکہ چھاپے اور جیل بھجوانے کے کام اس انداز میں نہیں کئے جاتے جس انداز میں کہ انہیں کیا جانا چاہیئے، قانون نافذ کرنے والے ادارے محض بے ترتیب انداز میں کارروائی نہیں کرتے۔ ان کے پاس شہادت اور معلومات موجود تھیں۔ تاہم، گرفتاریاں قانون کے مطابق نہیں کی گئیں۔

ایسے دو متاثرہ افراد کی ماں، سکینہ انجم، نے انٹرویو کے دوران اپنی کہانی سنائی۔ اس کے دو بیٹوں امجد اور اعظم کو حکام نے کراچی میں رینجرز کے ہیڈکوارٹرز پر حملے میں ملوث ہونے کے شبہ میں اٹھا لیا۔ جب ان دونوں کے خلاف کیسز درج ہوئے، تو سکینہ نے اپنے بیٹوں کو پنجاب میں چھپا دیا۔ تاہم، پولیس نے ان دونوں کا پتہ لگا لیا۔ سکینہ یہ سمجھتی ہے کہ پولیس نے محض شبے اور کسی واضح تفتیش کے بغیر اس کے دونوں بیٹوں کو جیل میں ڈلوا دیا۔ یہاں پر معذرت کے ساتھ یہ سوال پوچھے جانے کا جواز بنتا تھا کہ اگر وہ بے گناہ تھے تو اس نے انہیں چھپنے کے لئے کیوں بھیج دیا؟

اس کے مطابق، قانون نافذ کرنے والے ادارے لوگوں کے خلاف جھوٹے کیسز درج کرتے ہیں اور دوران حراست ان پر تشدد کرتے ہیں۔ سکینہ اپنے آپ کو خوش قسمت محسوس کرتی ہے کہ اس کے بیٹے آخر کار رہا کر دیئے گئے تھے۔ تاہم، وہ ایسے کیسوں کی جھوٹی ایف آئی آر اور پولیس کی جانب ان کے اندراج پر کنٹرول کے بارے میں ریاست کے اختیار پر سوال اٹھاتی ہے۔ ان جیسے کیسز پریشان کن ہوتے ہیں کیوں کہ وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے کام کرنے کے انداز کے بارے میں سنگین سوالات اٹھاتے ہیں۔ اگر ریاستی کنٹرول میں موجود یہ ادارے تفتیش کئے بغیر ایسی گرفتاریاں عمل میں لاتے ہیں، تو پھر ملک میں کوئی بھی شہری اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کر سکتا۔

حمیدہ بی بی ایسی ہی ایک بدقسمت ماں ہے۔ پولیس نے اس کے بیٹے طارق کو دہشت گرد سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے شبے میں اٹھالیا تھا۔ یہ خبر اس کے لئے ایک صدمہ لے کر آئی۔ اس نے اپنے بیٹے کو انصاف دلوانے کے لئے عدالتوں اور تھانوں کا راستہ اپنایا، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ شاہ نواز پر ڈاکہ زنی کا الزام تھا لیکن پولیس اس جرم میں اس کے ملوث ہونے کا کوئی بھی ثبوت پیش کرنے میں ناکام ہوگئی۔ اس کے مطابق، کسی قانون نافذ کرنے والے ادارے نے اس کیس کے سلسلے میں کسی بھی تفتیش کے لئے کبھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔ وہ ایک وکیل کی خدمات حاصل کرنے کے لئے بڑی مشکل سے کچھ پیسوں کا انتظام کر پائے، جب کہ کسی نے بھی ان کی اس پریشان کن حالت میں مدد کرنے کے لئے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ ان ماؤں کی جانب سے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ہدف بنایا جاتا ہے اور ان پر تنقید کی جاتی ہے جن کے بیٹوں کو غلط معلومات کی بنیاد پر یا محض شک کی بنا پر اور قانونی ضوابط پر عمل کئے بغیر پولیس اٹھا کر لے گئی، وہاں ایسے کیسز بھی موجود ہیں جہاں قانون نافذ کرنے والے ادارے نا صرف موزوں قانونی اقدامات اٹھانے میں ناکام رہے بلکہ درحقیقت دہشت گردی کے کسی ملزم کے خاندان کو تکلیف میں مبتلا کر دیا۔

زرینہ ایک ایسی ماں ہے جس نے نا صرف مستقل طور پر اپنا بیٹا کھو دیا تھا بلکہ پولیس نے ایک چھاپے کے دوران اس کا گھر لوٹ لیا اور روپے پیسے اور قیمتی اشیاء سے بھی محروم کر دیا تھا۔ زرینہ کا بیٹا،

علی، اپنی ماں سے ملنے کے بعد چلا گیا اور اس کے اگلے ہی روز، زرینہ کو میڈیا کے ذریعے اپنے بیٹے کی موت کا پتہ چلا۔ پولیس نے علی پر بدنام سرگرمیوں کا الزام عائد کیا تھا اور اس شبے میں اسے حراست میں لے لیا، اور تشدد کر کے اسے موت کی گھاٹ اتار دیا۔ نا صرف یہ بلکہ، زرینہ کے مطابق، چھاپے کے دوران انہوں نے اس کے بیٹے کے گھر سے قیمتی سامان بھی چرا لیا۔ ڈکیتی کی واردات کے بعد، لوگ عموماً پولیس سے مدد کے طالب ہوتے ہیں۔ لیکن زرینہ کیا کر سکتی تھی؟ کیوں کہ اس کے کیس میں، خود پولیس قصوروار تھی؟ وہ نا صرف اس کا بیٹا اپنے ساتھ لے گئے، بلکہ انہوں نے اسے اور اس کے خاندان کو مالی نقصان بھی پہنچایا۔

اس حصے میں ہم نے ریاست اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی نااہلی اور دہشت گردی کا شکار اور اس کا ارتکاب کرنے والوں دونوں کی ماؤں کی شکایات پر تبادلہ خیال کیا ہے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کہ ریاست ملک میں جاری دہشت گردی اور تشدد کے مسئلے سے نمٹنے کے لئے اقدامات کر رہی ہے۔ تاہم، حقیقت یہ ہے کہ وہ متاثرہ افراد کو کسی بھی قسم کا انصاف فراہم کرنے میں ناکام ہو رہی ہے، لوگوں کو بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے جیل کی سزا دلوا رہی ہے جو تشویش ناک ہے اور اس صورت حال کو دیکھنے کی اشد ضرورت ہے۔

بے جا یقین کا انجام

سکینہ نے حکام کے زیر حراست گم شدہ لوگوں کی رہائی کے لئے احتجاجوں میں سرگرمی سے حصہ لیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے اپنے دونوں بیٹوں، امجد اور اعظم، جن کی عمریں تیس سال کے وسط میں تھیں ان کو حکام نے اٹھا لیا تھا اور نو ماہ کے لئے زیر حراست رکھا تھا۔ بھائیوں میں سے ایک کراچی میں رینجرز ہیڈ کوارٹرز پر حملے کے سلسلے میں بھی مطلوب تھا۔ دونوں بھائیوں کو پنجاب سے گرفتار کیا گیا تھا کیوں کہ وہ وہاں رہائش پذیر تھے اور کام کر رہے تھے، جب کہ باقی ماندہ خاندان کراچی میں تھا۔ ان کی ماں کے مطابق، پولیس نے ان کے خلاف قتل اور ڈاکہ زنی کے کیسز درج کر رکھے تھے۔ سکینہ نے اپنے

بیٹوں کو ان کا مستقبل محفوظ رکھنے کے خیال سے شہر سے باہر بھیج دیا تھا، کیوں کہ کراچی میں صورت حال غیر مستحکم اور کشیدہ تھی۔ دونوں بھائیوں نے بمشکل آٹھویں اور دسویں جماعت تک تعلیم مکمل کی تھی۔ تیسرا ایک بھائی ایک میڈیا ہاؤس سے منسلک ہے، جب کہ اعظم نے ایک موبائل کی دوکان شروع کر رکھی ہے۔ سکینہ یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ان کا کسی بھی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور یہ کہ مشکل وقت میں کوئی بھی ان کی مدد کے لئے سامنے نہیں آیا۔ پولیس نے ان کے خاندان سے اعظم اور امجد کے سلسلے میں کبھی کوئی تفتیش نہیں کی۔

سکینہ کو یقین ہے کہ پولیس والے ترقیاں پانے کے لئے بے گناہ لوگوں کو پکڑتے ہیں اور ان کے خلاف جھوٹے مقدمات درج کرتے ہیں، جب کہ سیکورٹی نافذ کرنے والے اداروں کے تعاون سے سیاسی پارٹیاں دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ بیٹوں کی گرفتاریوں کے بعد، انہیں تلاش کرنے میں خاندان کو آٹھ ماہ لگے۔ خاندان نے عدالتوں اور پولیس سے رجوع کیا، جب کہ آخر کار انہیں قانونی کارروائی پر مجبور ہونا پڑا۔ اعظم اور امجد کو عدالتوں نے رہا کر دیا اور الزامات ثابت نہ ہونے کے بعد وہ رہا ہو گئے۔ ان کے واپسی کے بعد، دونوں بھائی اپنے گھر سے باہر نکلنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے تھے لیکن بعد ازاں صورت حال بہتر ہو گئی۔

''وہ میرا بیٹا ہے میں اسے جانتی ہوں''

بیس سالہ شاہ نواز پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہے اور خاندان کا واحد کفیل ہے۔ اس کی ماں حمیدہ بی بی کو تین سال تک آئے روز اپنے بیٹے کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کی تکلیف سے گزرنا پڑا۔ اس کے بیٹے نے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی اور ایک ویلڈر کی حیثیت سے ایک ٹھیکیدار کے ساتھ کام کیا۔ اس کے ذہن میں محفوظ شاہ نواز کی آخری خوشگوار یاد وہ تھی جب اس نے اسے ایک اسمارٹ پتلون اور قمیض پہنے ہوئے دیکھا تھا، اور وہ سبزی خریدنے کے لئے مارکیٹ گیا تھا۔ اسے وہیں گرفتار کر لیا گیا تھا، جب کہ خاندان پورا دن اس کے اتہ پتہ سے بے خبر رہا۔ انہیں اس کے ساتھ ہونے والے واقعے کا

اس وقت پتہ چلا جب میڈیا میں اس کے بارے میں خبریں آئیں۔حمیدہ بی بی کے مطابق، اس پر ڈاکہ زنی، ایک پولیس مقابلے اور بہت سے دیگر الزامات لگائے گئے تھے۔

حمیدہ بی بی کے مطابق وہ شاہ نواز کو بہتر جانتی ہے کیوں کہ وہ اس کا بیٹا ہے۔ وہ کسی بھی ایسے کاموں میں ملوث نہیں ہے جن کے اس پر الزامات لگائے گئے ہیں؛ بلکہ وہ ایک ایمان دار شخص ہے وہ باقاعدگی سے اپنی نماز بھی پڑھتا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ پولیس نے اس پر جھوٹے الزامات لگائے ہیں، اور شاہ نواز نے اس کو بھی بتایا ہے کہ وہ قصوروار نہیں ہے۔شاہ نواز کی غیر حاضری نے نا صرف خاندان کو ذہنی دباؤ کا شکار کیا، بلکہ انہیں مالی مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔حمیدہ کا شوہر خرابی صحت کی بنا پر کوئی کام کرنے کے قابل نہیں ہے اور چھوٹا بیٹا مناسب روزگار نہ مل سکنے کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کر رہا ہے۔حمیدہ بی بی اپنے بیٹے کی رہائی کے لئے اپیل کرتی ہے۔

تمام واقعات کو قلمبند کرتے وقت وہ تمام باتیں تازہ ہوگئیں جو مختلف ڈسٹرکٹ میں اسی حوالے سے بنائی گئی ڈاکومنٹری دیکھانے کے بعد ہمیں کہی گئیں تھیں۔ ملتان میں ایک سابق جج نے ڈاکومنٹری دیکھنے کے بعد کہا" تمام فساد کی جڑ عورت ہے"۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ اپنی بات کی وضاحت کریں تو انہوں نے کہا" ہمارے پاس ایسی مائیں بھی آتی تھیں جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کا بچہ گناہگار ہے اپنے بچے کو بے گناہ بتاتی تھیں اور فریاد کرتی تھیں کہ ان کے بچے کو چھوڑ دیا جائے، بلاشبہ محض ماں کی مامتا کی خاطر وہ برائی کا ساتھ دے رہی ہے"۔ایک وکیل نے کہا کہ " کوئی بھی ماں نہیں چاہتی کہ اس کا بیٹا برے کاموں میں ملوث ہو لیکن اکثر وہ اپنے بچوں کے کاموں سے بے خبر ہوتی ہیں، اور اکثر وہ ان کے غلط کاموں پر پردہ ڈالتی ہیں دونوں صورتوں میں ان کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے"۔ایک دوسرے شہر میں ایک ایسے نوجوان سے ملاقات ہوئی جس نے بتایا کہ اس کا باپ سرکاری ملازم تھا اور اس پر کرپشن کا الزام ہے اور صورتحال یہ ہے کہ وہ مشکل سے گزر بسر کرتے ہیں اب اس کا باپ ریٹائرڈ ہو چکا ہے، اس کا کہنا تھا کہ اس کے باپ سے پہلے جو افسر تھا اس نے کرپشن کی تھی اور الزام اس کے باپ پر لگایا گیا، ایک وقت اس پر ایسا آیا کہ وہ چاہتا تھا کہ اس کے باپ پر الزام لگانے والوں پر حملہ کرے لیکن

اس کی صحبت اچھی تھی اور اس کو سمجھانے والے لوگ اچھے تھے اس لیے وہ اس شر پسند عمل سے دور رہا"۔ ہمیں ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو اچھے اور برے کی پہچان کر سکیں اور مشکل کی گھڑی میں ثابت قدم رہ سکیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ انصاف فراہم کرنے والے اور قانون نافذ کرنے والے ادارے مثبت کردار ادا کریں۔

نااہلی کا شکار

زرینہ کے بیٹے کی کہانی شاید اس حوالے سے انوکھی ہے کہ وہ دہشت گردی کے تناظر میں سیکورٹی اداروں کی نااہلی کا شکار ہوا ہے۔ رزاق ایک سرکاری ملازم تھا، شادی شدہ تھا اور اس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ وہ خاندان کا واحد روزی کمانے والا تھا۔ ایک شام کو، وہ اپنی ماں سے ملنے کے لئے آیا اور پھر اپنے گھر کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ آیا پولیس نے اسے تھانے بلوایا یا اس کے گھر میں جا گھسی، لیکن اگلی صبح اخبارات میں اس حوالے سے خبر تھی۔ زرینہ نے بہت شور وغل کیا اس کا کہنا ہے کہ اس کو معلوم ہے کہ یہ کام پولیس ہی کر سکتی ہے۔ زرینہ کے مطابق، یہ غلط شناخت کا ایک کیس تھا، کیوں کہ پولیس نے اس کے بیٹے کو اس کا ایک ہم نام بدنام ڈاکو سمجھا اور موزوں تفتیش کے بغیر غلط معلومات پر کارروائی کر ڈالی۔

دوستوں اور رشتہ داروں نے رزاق کی لاش مردہ خانے سے حاصل کی۔ زرینہ کہتی ہے کہ پولیس رزاق کے گھر میں جا گھسی اور نا صرف قیمتی آلات بلکہ کھانے پینے کی اشیاء بھی اٹھا کر لے گئی۔ خاندان کی جانب سے درخواستیں جمع کروائی گئیں، لیکن ان پر کوئی کارروائی نہ ہوئی۔ زرینہ بے بسی کی حالت میں بتاتی ہے کہ ''ہم کچھ نہیں کر سکتے اللہ ہمارا بدلہ لے گا، کیوں کہ ہم نے ہر چیز اسی پر چھوڑ دی ہے۔'' نا جانے اس میں کتنے الزامات ہیں اور کتنے حقائق لیکن یہ ایک سوچ ہے کہ ہمارے قانون نافذ کرنے والے ادارے ہمارا اعتماد بحال کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔

بے بسی

دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والوں کی مائیں ان کے گھروں پر چھاپہ مارنے اور ان کے بیٹوں کو بغیر کسی وارنٹ یا بغیر کسی وجہ کے جیل لے جانے کے لئے سیکورٹی اداروں کو موردِ الزام ٹھہراتی ہیں، دوسری جانب دہشت گردی کا شکار ہونے والوں کی ماؤں کو پاکستان کے عدالتی نظام پر اور درحقیقت، خود ریاست پر، بہت کم بھروسہ ہے۔ ان کے مطابق، ریاست انہیں کسی بھی انداز میں مدد دینے میں ناکام ہو چکی ہے، چاہے وہ مالی امداد ہو یا ان کی اور ان کے پیاروں کی سیکورٹی کو یقینی بنانے کا معاملہ ہو۔ کچھ ایسے بھی خاندان ہیں جنہوں نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے، کیوں کہ وہ خود کو بے بس تصور کرتے ہیں۔ تشدد کا شکار ہونے والوں کی ماؤں کی ایک بڑی شرح فی صد اپنی دل دکھانے والی کہانیوں اور نہ ختم ہونے والے صدمے کو دہراتی ہیں، جو ان کے مطابق ان کے مرنے تک ان کے ساتھ رہے گا۔ زاہدہ کی کہانی بھی بے بسی کی ایسی ہی ایک مثال ہے۔

خاندانوں، خصوصاً ماؤں نے وقت کے ساتھ ساتھ بے بسی کی زندگی گزارنا سیکھ لیا ہے۔ جب تشدد کے شکار افراد کی ماؤں سے پوچھا گیا کہ آیا وہ اپنے نقصان کے لئے تشدد کا ارتکاب کرنے والوں سے قانونی انتقام لینا چاہیں گی، تو ان میں زیادہ تر نے ''نا'' میں جواب دیا۔ اس جواب کی بڑی وجہ ایک بار پھر حکومت پر بھروسے کی کمی اور بے بسی ہے۔ تاہم، ایک بہت اہم نکتے کا مشاہدہ بھی کیا گیا؛ دہشت گردی کا شکار ہونے والوں کی زیادہ تر ماؤں نے مذہب کے ساتھ اپنے بندھن کو مضبوط کر لیا ہے۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ آیا یہ بندھن پہلے سے موجود تھا یا نہیں، لیکن اب یہ واضح طور پر موجود ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ بالآخر اللہ ایسے لوگوں سے ضرور انتقام لے گا جنہوں نے ان کے پیاروں کو کھونے میں اپنا کردار ادا کیا۔ انٹرویو کی جانے والی دہشت گردی سے متاثرہ افراد کی ماؤں میں سے ایک نے اپنے بیٹے کے قاتلوں سے ایک بار ملنے اور ان سے اسے نشانہ بنانے کی وجہ پوچھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے یہ دعا کی کہ کسی کو بھی ایسی تکلیف سے نہیں گزرنا چاہیئے جس سے کہ وہ گزر

چکی ہیں ان کے عدم اعتماد نے انہیں اس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے کہ انہیں اپنی دعاؤں پر بھی بہت کم یقین باقی رہ گیا ہے۔

ایک اور ماں عظمیٰ، جس کی زندگی ایک بم دھماکے کے بعد تباہ ہو کر رہ گئی ہے جس نے اس کا ۲ سالہ بیٹا چھین لیا اور اس کے بڑے بیٹے اور شوہر کو زخمی کر دیا، اب وہ بے پناہ کرب کی زندگی گزار رہی ہے۔ اس مصیبت کے وقت، کوئی بھی اس کی مدد کے لئے آگے نہیں آیا اور اسی لئے وہ اب کسی سے بھی کسی قسم کی امید نہیں رکھتی۔ اس نے اس معاملے کو اپنے خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ عدالتی نظام اور ریاستی اداروں پر انتہائی بداعتمادی کا اظہار کرتی ہے اور یہ خیال کرتی ہے کہ وہ لوگوں کی حفاظت کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ عظمیٰ کو پختہ یقین ہے کہ اللہ اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو ان کے غلط کاموں کے لئے سزا ضرور دے گا۔ اس کے مطابق، یہ لوگ پیسوں کے لالچ میں ایسے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور دوسروں کی تکلیف کا خیال نہیں کرتے۔ وہ ان سے اپیل کرتی ہے کہ ایسی بے رحمانہ قتل و غارت گری کو بند کر دیں اور اس بات کا احساس کریں کہ وہ غلط راستے پر ہیں۔ عظمیٰ کہتی ہے کہ ممکن ہے انہیں بھی اس قسم کے المیے کا سامنا کرنا پڑ جائے، اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ انہوں نے دوسروں کے ساتھ غلط کیا تھا۔

یہاں ذکر کردہ کہانی میں وہ بے بسی چھلکتی ہے جو دہشت گردی کا شکار ہونے والوں کی ماؤں نے محسوس کی تھی۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ان کی بے بسی نظام پر ان کے عدم اعتمادی کے ساتھ ساتھ نفسیاتی بے بسی کا نتیجہ ہے۔ بے بسی ایک ایسی چیز ہے جو لوگوں میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ یہ محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ان پر مسلط کی گئی کوئی بھی صورت حال ان کے قابو سے باہر ہے پھر وہ بھی بے بس ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل لوگوں کو امدادی سرگرمیوں یا تبدیلی کے لئے مواقع سے غفلت برتنے کی طرف راغب کر سکتا ہے۔ جب کہ اس سلسلے میں بے بسی کے نفسیاتی پہلو کا علاج کرنا مشکل ہو سکتا ہے، ریاست انصاف کی فراہمی اور دہشت گردی کے مسئلے پر قابو پانے کے لئے اقدامات کو یقینی بنانے کے لئے حل پیش کرتے ہوئے اس مسئلے کو حل کر سکتی ہے۔

احمقانہ قتل

رضیہ اسی قسم کی ایک بدقسمت ماں ہے۔ اس نے اس تشدد میں اپنا پندرہ سالہ بیٹا شبیر کھو دیا جس نے کراچی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ شبیر نے اپنی پڑھائی چھوڑ دی تھی اور ایک دوکان پر ملازمت اختیار کر لی تھی، کیوں کہ اس کا خاندان اس کی تعلیم کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس روز شہر بھر میں تشدد کی فضا تھی پورا شہر گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج رہا تھا۔ جب شبیر مقررہ وقت گھر نا پہنچا تو رضیہ کی تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ اس نے اور خاندان کے افراد نے شبیر کو ہر جگہ تلاش کیا لیکن اسے کہیں کوئی معلومات نا ملی کہ وہ آخر گیا کہاں۔ بالآخر دو روز بعد، پولیس نے اس کے بیٹے کی لاش رضیہ کے حوالے کر دی۔ اس غم سے رضیہ کو نفسیاتی طور پر ایک دھچکا لگا اب وہ ریاست یا کسی اور فرد سے کسی قسم کے انصاف کی امید نہیں رکھتی۔

اب تشویش، اذیت اور خوف میں تبدیل ہو چکی ہے۔ انہوں نے پولیس سے رابطہ کرنے اور دو تھانوں میں ابتدائی معلوماتی رپورٹس یا ایف آئی آرز درج کروانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان میں امید کی اس کرن کے باوجود کہ شبیر خیریت سے ہوگا، وہ اسپتالوں اور مردہ خانوں میں بھی گئے، لیکن اس کا اتہ پتہ معلوم ہونے میں کوئی پیش رفت نہ ہوسکی۔ شبیر کے گم ہو جانے کے دو روز بعد، اس کے خاندان کو اطلاع دی گئی کہ اس کی لاش مل گئی ہے۔ اس کے سر اور جسم کے باقی ماندہ حصوں میں جگہ جگہ گولیوں کے نشانات تھے۔ ضرورت کے اس وقت میں، خاندان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا گیا اور کسی نے بھی ان کی مدد کرنے کے لئے رابطہ نہ کیا۔ رضیہ کو اب اپنے خاندان کے لئے روزی کمانے کی خاطر لوگوں کے گھروں میں کام کرنا پڑتا ہے کیوں کہ اس کا شوہر خرابی صحت کی وجہ سے روزی کمانے کے قابل نہیں ہے۔ خاندان عدالتوں سے رجوع کرنے کے بھی قابل نہیں ہے کیوں کہ وہ قانونی فیسوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے، کیوں کہ وہ اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ وہ قصورواروں کو ضرور سزا دے گا۔ رضیہ کی رائے میں حکومت ان کے مسائل حل کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ وہ التجا کرتی ہے کہ ''ہم

امن اور سکون چاہتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے بچے باہر جائیں اور پھر ہمیں ان کی لاشیں ملیں۔''

''میں نے سب کچھ کھو دیا.....''

جہانزیب ایک ۱۵ سالہ لڑکا تھا، جو کمپیوٹرز اور انٹرنیٹ میں گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ انفارمیشن ٹیکنالوجی میں اپنی انٹرمیڈیٹ کی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد اپنے خاندان کے ہمراہ ملیشیاء جانا چاہتا تھا۔ عباس ٹاؤن، کراچی کا رہائشی جہانزیب ۳ مارچ ۲۰۱۳ء کے دھماکے کا شکار ہوگیا تھا۔ اپنی موت سے چند دن قبل ان نے اپنے باپ سے سالگرہ کے پیشگی تحفے کے طور پر ایک ایل سی ڈی حاصل کی تھی۔ وہ اپنی سولہویں سالگرہ دیکھنے کے لئے زندہ نہیں بچا جو دو ماہ دور تھی۔ اس کی ماں نرجس نا صرف اپنے بیٹے، بلکہ اپنے شوہر اور گھر کے بنیادی روزی کمانے والے کو کھونے کے ذہنی کرب سے گزری تھی۔ جہانزیب اور اس کے تین بہن بھائی شام میں اپنے باپ کی مدد کرنے کے لئے اپنے انکل کی دوکان پر گئے تھے۔ اس کا باپ صبح کام پر جاتا تھا اور شام کو دو کانوں پر کام کرتا تھا۔ ایک دن، نرجس کے دو جیٹھوں کے بجائے، اس کا شوہر اور بیٹا دو کانوں پر موجود تھے۔ چند منٹ کے بعد اس پلازے کے اردگرد جہاں دوکان واقع تھی، ایک بہت بڑے دھماکے نے علاقے کو ہلا کر رکھ دیا۔

نرجس، صدمے کی حالت میں باہر کی جانب دوڑی اور تین بچوں کو اپنی جانب دوڑ کر آتے ہوئے دیکھا۔ دھماکے کے نتیجے میں اس کی دو بیٹیوں کو خراشیں اور زخم آئے تھے وہ فوری طور پر اسپتال کی جانب روانہ ہوئی۔ پورا علاقہ افراتفری اور قتل عام کا منظر پیش کر رہا تھا۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ پلازہ شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ ہسپتال پہنچنے تک وہ پنے شوہر اور بیٹے کی سلامتی کے لئے دعا کرتی رہی تھی۔ واپسی پر نرجس نے اپنے بچوں کو بہن کے ہاں چھوڑا، کیوں کہ اپنے شوہر اور جہانزیب کی خیریت کی خبر حاصل کرنا چاہتی تھی۔ نرجس کی دعائیں قبول نہیں ہوئیں!!! اس کا شوہر اور بیٹا اپنے آٹھ ملازمین کے ہمراہ دھماکے میں شہید ہو چکے تھے۔ امدادی ٹیمیں اس دھماکے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ملبے سے صرف اس کے شوہر کی لاش نکال سکی تھیں۔ جہانزیب کی لاش کے ٹکڑے ملے تھے

اور اسے اس کے پاؤں سے پہچانا گیا تھا۔ اس المناک سانحے کو بیان کرتے ہوئے نرجس نے کہا ''میں نے اس روز سب کچھ کھو دیا۔''

حالانکہ دوستوں، رشتہ داروں اور حکومت نے مدد کی، پھر بھی اس سانحے نے انہیں سماجی، نفسیاتی اور مالی طور پر تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس کی بیٹی کو اپنے زخموں کے علاج کے لئے تین دن اسپتال میں رہنا پڑا۔ اچانک مالی دباؤ کی وجہ سے اس کے دونوں جیٹھ ان کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے خیالات اب بھی اپنے شوہر اور خصوصاً اپنے بیٹے کی یاد کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ہر روز، گھر میں ادھر اُدھر بکھری ہوئی جہانزیب کی چیزیں دیکھتی ہے اور اس کی غیر موجودگی کو اور زیادہ محسوس کرتی ہے۔ دہشت گردی میں ملوث لوگوں کے بارے میں وہ کہتی ہیں، ''میں اس بات پر یقین نہیں کرتی کہ ایسے وحشیانہ جرائم میں ملوث لوگوں کا انسانیت سے کوئی تعلق ہے۔ اگر ایسا کوئی رشتہ ہوتا، تو وہ ان سرگرمیوں کا کبھی ارتکاب نہ کرتے۔ ایک بات تو یقین سے کہی جا سکتی ہے بلکہ وہ ہمارے معاشرے کا ہی ایک حصہ ہیں۔ دنیا کا کوئی ایک مذہب بھی تشدد اور خون ریزی کی تبلیغ نہیں کرتا۔ یہ لوگ ان باتوں سے نابلد ہیں، اگر وہ اسلام میں انسانی زندگی کو دی گئی اہمیت کے بارے میں جانتے ہوتے، تو وہ یہ حرکت کبھی نہ کرتے۔ یہ مذہبی عالموں اور صاحبان فکر کا فرض ہے کہ وہ ان کی رہنمائی کریں اور ان تک یہ بات پہنچائیں کہ وہ غلط راستے پر ہیں۔''

نرجس یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ اکیلی ماں نہیں ہے جو اپنے پیاروں کو کھو چکی ہیں۔ اس نے مشاہدہ کیا ہے کہ ایسے واقعات روزمرہ کی بنیاد پر رونما ہو رہے ہیں، جب کہ وہ معاشرے کے اندر ایسے مسائل کو روکنے اور انہیں حل کرنے کی خواہش کی کمی بھی محسوس کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ان دہشت گردوں کو عدالتوں میں گھسیٹا جائے اور موقع پر ہی انہیں سزا دی جائے، تاکہ کوئی بھی ایسے جرم کا ارتکاب کرنے کا سوچنے سے باز رہے۔ ایسے سانحات میں بچ جانے والوں اور ان کا شکار ہونے والوں کے خاندانوں کے لئے نرجس نے یہ تجویز کیا ہے کہ وہ، ''.....صبر سے کام لیں، اور اللہ پر امید اور بھروسے کو مت چھوڑیں.....درست راستے سے نہ ہٹیں.....مذہب تشدد کی تبلیغ نہیں کرتا۔''

قوتِ برداشت

عظمیٰ رمضان کا بیٹا محمد ریحان ابھی اپنے اردگرد کی دنیا کو سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ دو سال کی عمر میں ایک بم دھماکے کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس کے شوہر اور بڑے بیٹے کو شدید زخم آئے تھے، جب کہ اس کا شوہر ابھی تک صدمے، غیر یقینی اور سوگ کی حالت میں ہے۔ اس کا شوہر روزی کمانے کے قابل نہیں رہا۔ عظمیٰ کو ابھی اپنے بیٹے کے غم کا سامنا کرنے کے ساتھ ساتھ اس بیٹے کی تکلیف بھی ہے جو زخموں سے چور ہے اور اس کی حالت دیکھ کر اسے اپنے موت کے منہ میں جانے والے بیٹے کی یاد آتی ہے۔ ایک دن، باپ نے بچوں کو باہر لے گیا عظمیٰ نے ریحان کو نہلایا تھا اور اسے نئے کپڑے پہنائے تھے، اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا'' مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ اس کا آخری غسل ہوگا۔'' جب کہ عظمیٰ گھر پر رک گئی، دونوں بچے اپنے باپ کے ساتھ جوس کی دوکان پر گئے۔ دوکان کے برابر میں کھڑے ایک رکشہ کے اندر بم رکھا گیا تھا اور جب یہ خاندان مشروبات سے لطف اندوز ہو رہا تھا تو یہ بم پھٹ گیا۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر یہ خبر گھر والوں تک پہنچ گئی تھی اور پورا خاندان اسپتال پہنچ گیا تھا۔ اسے نا صرف اپنے شوہر اور بڑے بیٹے کو آنے والے زخموں کی تکلیف بلکہ اپنے دو سالہ معصوم بچے کو کھونے کا غم بھی برداشت کرنا پڑا تھا۔ حکومت یا کوئی ادارہ ان کی مدد کو نہ پہنچا بلکہ ضرورت کے اس وقت میں دوستوں اور رشتہ داروں نے ان کی مدد کی۔ عظمیٰ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتی ہے اور کہتی ہے کہ شہری ان عناصر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے وہ صرف صبر کر سکتے ہیں۔

انکار

ہماری ریسرچ اور تشدد کا ارتکاب کرنے والوں اور ان کا شکار ہونے والوں کی ماؤں سے باہمی بات چیت کے دوران، یہ انکشاف ہوا کہ تقریباً ہر ماں اپنے بچے کی ممنوعہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے سے مکمل طور پر انکاری تھی سوائے دو ماؤں کے ایک وہ ماں جو یہ کہتی ہیں کہ مجھے معلوم ہے جعلی

ملاں بھی ہوتے ہیں اوران کا بیٹاان کے ساتھ کام کرنے لگ گیا تھااور دوسری وہ مائیں جوانجان ہیں اور ان کومعلوم نہیں کہ طالبان کیا کام کررہے ہیں وہ اسی بات پر یقین کرلیتی ہیں جوان کو بتایا جاتا ہے اگران کوکہا جاتا ہے کہ طالبان حق پر ہیں تو وہ اسی کودرست مان لیتی ہیں۔دوسری جانب ماؤں کے انکار کی وجہ یہ حقیقت بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی سرگرمیوں سے بےخبرتھیں یا کسی کے سامنے یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھیں کہ ان کا بیٹا قصوروار ہے۔جرم کا ارتکاب کرنے والے زیادہ تر افرادمقدموں کا سامنا کررہے ہیں، اورانہیں یہ خوف بھی ہوسکتا ہے کہ ایسا کوئی بیان ان کے مقدمے پر برے اثرات مرتب کرسکتا ہے۔ان تمام عوامل کوذہن میں رکھتے ہوئے، ماؤں نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے بچے بےگناہ ہیں، اوراس سلسلے میں انہوں نے کئی حوالے دیئے۔

صادقہ بیگم کواس بات پر یقین ہے کہ اس کا بیٹا شوکت بےگناہ ہے، جب کہ اس کا مقدمہ دہشت گردی اورقتل کے الزامات کےتحت زیرسماعت ہے۔اس کوگرفتار کئے ہوئے نوسال ہوچکے ہیں اوروہ اپنے خلاف کیسز میں سے ایک میں بری بھی ہوچکا ہے۔شوکت ماں کے بیمار ہونے پراس کی دیکھ بھال کیا کرتا تھااوراب بھی اسے یادکرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے ہیں۔اس کے مطابق، ''کبھی کبھاروہ ایک اجتماع (مذہبی ریلی) میں جایا کرتا تھا، ہرکوئی ایسے اجتماعات میں جاتا ہے، اس میں تو کوئی غلط بات نہیں ہے۔'' اس سے قبل، شوکت کوایک احتجاج کے دوران سڑک بلاک کرنے اوردنگا فساد برپا کرنے پردومرتبہ گرفتار کیا جاچکا تھا۔اس نے آٹھویں جماعت تک پڑھائی کی تھی اوراپنی مذہبی تعلیم ایک قریبی مسجد سے حاصل کی تھی۔شوکت نے پھرایک پبلک کال آفس پرکام کرنا شروع کردیا تھااور بعدازاں مرغیاں لانے لے جانے کا کام بھی کرتا تھا۔جس روزاسے گرفتار کیا گیا، وہ اپنی گاڑی میں پیٹرول ڈلوانے گیا ہوا تھا۔خاندان کوتین روزتک اس کا اتہ پتہ معلوم نہیں ہوا تھا، جب تک کہ اس کا نام میڈیا پرنہیں آ گیا۔اس خبر نے پورے خاندان کوصدمہ پہنچایا اورانہوں نے اس کی تلاش شروع کردی۔صادقہ یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس کی گرفتاری کے بعد، اسے ابتدائی طور پرایک نامعلوم جگہ لے جایا گیا تھا۔

صادقہ بتاتی ہے کہ پولیس ان کے گھر کی تلاشی لینے کے لئے صبح ۳ بجے ان کے گھر آئی تھی لیکن انہیں کچھ نہیں مل سکا تھا۔ خاندان نے مختلف وکیلوں سے رابطہ کیا لیکن اب وہ کوئی وکیل کرنے کے قابل نہیں ہیں کیوں کہ اخراجات کا بوجھ بڑھ چکا ہے۔ بڑھاپا اور حالات کا دباؤ صادقہ بیگم پر اثر انداز ہوئے ہیں، کیوں کہ اب وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ اپنے بیٹے سے ملاقات کے لئے نہیں جاسکتی۔ کوئی بھی فرد یا ادارہ ان کی مدد کے لئے آگے نہیں آیا۔ صادقہ بیگم اس بات پر قائم ہے کہ شوکت اتنے وحشیانہ جرائم کا ارتکاب نہیں کرسکتا جس میں اس کے مبینہ طور پر ملوث ہونے کا الزام لگایا گیا ہے، کیوں کہ اس کا کسی بھی گروپ سے تعلق نہیں ہے۔ وہ اصرار کرتی ہے کہ شوکت ایک فرمانبردار، مذہبی اور سچا بیٹا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی، تو اسے ضرور معلوم ہوتی۔ پولیس نے اسے بتایا ہے کہ ''اماں، تم کچھ نہیں جانتیں .....،'' لیکن وہ ان کا یقین کرنے سے انکار کرتی ہے۔ صادقہ کے مطابق، ''کیا شوکت کی گرفتاری کے بعد پاکستان میں امن ہوگیا ہے؟ دہشت گردی اب بھی جاری ہے ..... یہ کیوں ختم نہیں ہوئی؟ میرا بے گناہ بیٹا جیل میں ہے..... بدقسمتی سے یہاں کسی کو انصاف نہیں ملتا .....صرف خدا اور حکومت دہشت گردی میں کمی کرسکتے ہیں، کسی اور میں ایسا کرنے کی سکت نہیں ہے۔''

ایسی ہی ایک صورتحال محمد عاطف کی ماں کی زبانی بھی معلوم ہوئی جسے ڈاکہ زنی کے واقعات اور پولیس مقابلوں میں حصہ لینے کے الزامات پر گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کی ماں شاہدہ کا دعویٰ ہے کہ وہ سلجھا ہوا لڑکا ہے ''وہ میرا بیٹا ہے، میں اسے جانتی ہوں''۔ اسے یقین ہے کہ وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے جھوٹے، گھڑے ہوئے الزامات کا شکار ہوا ہے۔ انکار کا عنصر صادقہ کے کیس میں خاص طور پر عیاں ہے کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ اس کا بیٹا ماضی میں پرتشدد سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والوں کی ماؤں کے ساتھ کئے جانے والے زیادہ تر انٹرویوز میں ظاہر ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کے بیانات کی جانب جھکاؤ رکھتی ہیں اور ان کی بات پر یقین کرتی ہیں۔ مائیں ان وجوہات اور حالات سے آگاہ نہیں ہیں جو قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے ان کے بچوں کو مقدمات میں پھنسانے کی وجہ بنے ہیں۔ اپنے بیٹوں کی بے گناہی کا یقین سیکورٹی اداروں کے برتاؤ کے ساتھ

مزید مضبوط ہو جاتا ہے، جہاں وہ گھروں میں چھاپے مارتے ہیں اور وارنٹ اور الزامات کے بغیر قانونی طریقہ اپنائے لوگوں کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ پھر شواہد کی کمی، مناسب تفتیش کا نہ ہونا، لمبی عدالتی کارروائیاں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں سے تعلق رکھنے والے ملازمین کی جانب سے رشوت کا مطالبہ جیسے عوامل بھی موجود ہیں۔ ان عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے صادقہ نے یہ سوال کیا کہ کیا اس کے بیٹے کی گرفتاری کے بعد ملک میں امن قائم ہو گیا ہے؟۔

والدین، خصوصاً مائیں، اپنے بچوں کے لئے بہت پیار رکھتی ہیں، وہ اپنی اولاد کی جانب سے کئے جانے والے کسی بھی غلط کام سے انکار کر سکتی ہیں۔ یہ بات نا صرف انکار تک محدود رہتی ہے بلکہ اپنے بچے کے تحفظ کے لئے دفاعی قدم کے طور پر حقیقت کو عیاں نا کرنا بھی ایک صورت ہے۔ جرم کا ارتکاب کرنے والوں کی انٹرویو دینے والی زیادہ تر ماؤں نے ذمہ داری کسی اور پر منتقل کر دی ہے۔ اس صورت حال کی عکاسی دہشت گردی کے مبینہ مرتکب حافظ قاسم رشید کی ماں، ام تمیم کے بیان میں بھی ہوتی ہے، ''میں نہیں سوچتی کہ ہمارے بچے ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہیں، لیکن جو ہیں، وہ اپنے منطقی انجام کو پہنچیں گے۔''

جہالت کے فریب

دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والوں کی ماؤں سے انٹرویوز کرتے ہوئے، ہمارے ریسرچرز اور تجزیہ نگاروں نے ماؤں کی اپنے بچوں کی سرگرمیوں سے ناواقفیت کے عنصر کا مشاہدہ کیا تھا۔ ان کے ذہن میں اپنے بچوں کی سرگرمیوں کے بارے میں غلط تصورات موجود تھے، جو زیادہ تر ان کی اولاد کی جانب سے ان کے ذہن میں بٹھائے گئے تصور پر مبنی تھے۔ غلام فاطمہ یہ دعویٰ کرتی ہے کہ توفیق اس کے بہت قریب تھا۔ فاطمہ یہ یقین بھی رکھتی ہے کہ کیوں کہ وہ ایک اچھی ماں ہے، اس کا بچہ کبھی بھی کسی برے کام میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ یہ بات والدین کے مثبت فریب سے منسلک ہوتی ہے، جہاں والدین اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کی بہت زیادہ تعریف کے قابل تصور کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اچھے والدین تصور

کرتے ہیں، جب کہ اس کی نتیجے میں یہ بات بھی ذہن میں بٹھا لیتے ہیں کہ ان کا بچہ بھی دیگر بچوں کی نسبت بہتر ہوگا۔اس فریب کو مبینہ طور پر دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والے کے مذہب اور مذہبی سرگرمیوں کی دلچسپی کے ساتھ بھی منسلک کیا جاتا ہے۔

حلیمہ بی بی کا کیس کچھ مختلف ہے، جو یہ تسلیم کرتی ہے کہ اس کا بیٹا مذہب پر مبنی پرتشدد انتہا پسند سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ وہ ان لوگوں سے آگاہ تھی جن کے ساتھ وہ اٹھتا بیٹھتا تھا اور اس بات پر وہ اس سے جھگڑ بھی چکی تھی، لیکن اس نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ دوستی میں اس کی غلط ترجیح کا حوالہ دیتی ہے جس نے اس کی جانب سے ایک پرتشدد راستہ اختیار کرنے میں ایک کردار ادا کیا۔اس حقیقت کے باوجود کہ دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والے کچھ افراد کا پرانا ریکارڈ ظاہری طور پر ان کے پرتشدد یا سماج مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا غمازی ہے، مائیں اپنے بیٹوں کو بے گناہ اور جھوٹے الزامات کا شکار سمجھتی ہیں جو قانون نافذ کرنے والے اداروں نے ان کے خلاف عائد کئے ہیں۔ یہ بات شوکت، توفیق اور قاسم کے کیسوں میں عیاں ہے، جنہیں پہلے بھی دہشت گردی کے الزامات پر گرفتار کیا جا چکا تھا۔توفیق نے دسمبر ۲۰۰۶ء میں اپنی گرفتاری کے بعد دو سے تین سال جیل میں گزارے تھے جب کہ جس تنظیم کے ساتھ وہ منسلک تھا وہ اس وقت بھی اسے قانونی مدد فراہم کر رہی ہے۔ مائیں ان کیسوں میں ان کے الحاق کے بارے میں واقف ہونے کے باوجود، ایک مغالطے میں مبتلا ہیں، جہاں وہ اپنے بیٹوں کے ملوث ہونے کی جانب اشارہ کرنے والے واضح عوامل کو بڑے آرام سے نظر انداز کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اپنے بچوں کی جانب سے کی جانے والی حرکتوں سے ناواقف مائیں اس فریب میں بھی مبتلا ہوتی ہیں کہ ان کے بیٹے سیدھے راستے پر ہیں۔ سکینہ انجم کے دو بیٹے دہشتگردی کے الزامات کے تحت قانون نافذ کرنے والوں نے گرفتار کر لئے تھے، حالانکہ یہ الزامات کبھی ثابت نہیں ہو سکے۔ وہ اس بات پر قائم ہے کہ ''اگر والدین ایسی پرتشدد سرگرمیوں میں ملوث نہ ہوں، تو پھر بچے کیسے بے نقاب ہوں گے؟ یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کی ٹھیک تربیت کریں..... میرے بچے نے اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کی۔''

قانون نافذ کرنے والے اداروں کا رویہ بھی ان کی سوچ کو مستحکم کرتا ہے، جہاں وہ دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والوں کے خاندانوں کے علم میں لائے بغیر گرفتار کر لیتے ہیں یا اٹھا لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں، تشدد کی بنیاد پر معلومات حاصل کی جاتی ہیں اور اعتراف جرم کروایا جاتا ہے۔ فاطمہ کے بیٹے رحیم اللہ کے کیس میں، خاندان کو پانچ روز کے بعد معلوم ہوا کہ اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ فاطمہ یہ دعویٰ بھی کرتی ہے کہ اس دوران اس پر تشدد بھی کیا گیا۔ ''اسے بری طرح ٹارچر کیا گیا اور اس کے پورے جسم پر زخم تھے، جب کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں میں زنجیریں ڈالی گئی تھیں۔'' سکینہ انجم کے کیس میں، اسے اپنے بیٹوں کے اتہ پتہ کے بارے میں حراست میں لئے جانے کے آٹھ ماہ بعد معلوم ہوا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے اپنائے جانے والے طریقے ایسے اقدامات کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں اگر گرفتار کیا جانے والا فرد قصوروار ہو۔

زیادہ تر، والدین تشدد کے ان اثرات سے ناواقف نہیں ہوتے جس نے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ عزت خاتون، جس کے بیٹے کو مبینہ طور پر قانون نافذ کرنے والے ادارے نے اٹھا لیا ہے کہتی ہے، ''میں نہیں جانتی کہ اس قسم کی سرگرمیوں میں کون ملوث ہے..... یہ تمام تشدد اور قتل و غارت غلط ہے۔'' حلیمہ بی بی کے تاثرات بھی کچھ اسی قسم کے ہیں: ''میں ان لوگوں سے جو ایسے جرائم میں ملوث ہیں یہ کہنا چاہوں گی کہ وہ ایسے کام نا کریں اور اچھے انسان بن جائیں۔'' تاہم، ایک اور طرح کی سوچ رکھنے والے بھی موجود ہیں، جہاں والدین کالعدم گروہوں کی جانب سے اپنائے گئے پر تشدد طریقوں کو درست سمجھتے ہیں۔ اس پر بعد میں آنے والے سیکشن میں مزید بحث کی جائے گی۔

''اچھی عادات کا مالک ایک لڑکا.....''

غلام فاطمہ کے مطابق، کراچی کا رہائشی اس کا ۲۶ سالہ بیٹا توفیق انصاری بہت فرمانبردار، مودب اور مذہبی لڑکا تھا۔ اس نے آٹھویں جماعت تک سرکاری اسکول میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ وہ یقین رکھتی ہے کہ وہ اپنے بچے کو بہتر طور پر جانتی ہے اور توفیق کو اپنے بہت زیادہ قریب سمجھتی ہے۔ فاطمہ کو یقین ہے کہ وہ اسے ہر بات بتایا کرتا تھا اور کچھ نہیں چھپاتا تھا۔ وہ اس کے مذہب کی طرف رجحان پر زور دیتی ہے جسے وہ اس کے قصوروار نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ گردانتی ہے۔ توفیق مذہبی گروپوں اور سیاسی پارٹیوں کی طرف سے ترتیب دیئے گئے مذہبی اجتماعات اور جلوسوں میں شرکت کیا کرتا تھا۔ وہ ایک وکیل کے ساتھ سٹی کورٹ میں کام کیا کرتا تھا اور ۱۰,۰۰۰ روپے تک کما لیا کرتا تھا۔ فاطمہ نے بھی اس وکیل سے ایک یا دو مرتبہ ملاقات کی تھی، توفیق، دو دیگر افراد کے ساتھ، پہلے بھی دسمبر ۲۰۰۶ء میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے گرفتار کیا جا چکا تھا۔ یہ معلومات فاطمہ نے ہمیں بتائی تھیں اور دیگر ذرائع سے بھی ہم تک پہنچی تھیں۔ تاہم، وہ ان الزامات کو ہو بہو بتانے سے قاصر تھی جن کے تحت اسے گرفتار کیا گیا تھا۔

اس نے دو سے تین سال جیل میں گزارے اور اسے بعد میں رہا کر دیا گیا۔ وہ وکیل جس کے لئے توفیق کام کیا کرتا تھا ایک پرتشدد فرقہ وارانہ گروپ کی نمائندگی کرتا تھا اور گمشدہ افراد (مبینہ طور پر قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے اٹھا لئے جانے والے) کے کیسز بھی دیکھتا تھا۔ وکیل کو نشانہ بنایا گیا اور جنوری ۲۰۱۲ء میں اسے گھر جاتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔ توفیق اپنی حفاظت کے سلسلے میں بہت فکرمند تھا اور اس نے ایبٹ آباد جانے کا فیصلہ کر لیا تھا، جہاں وہ اپنی آنٹی کے ہاں ۱۵ سے ۲۰ روز ٹھہر سکتا تھا۔ وہاں جاتے ہوئے، اسے جرائم کی تحقیقات کرنے والے ادارے سی آئی ڈی نے گرفتار کر لیا، جنہوں نے اس کی رقم، کیمرہ اور کپڑوں سمیت ہر چیز ضبط کر لی۔ اس کا خاندان اس غیر آشکار صورت حال سے بے خبر تھا اور اپنے بیٹے کی جانب سے کسی رابطے کے انتظار میں تھا۔ بالآخر جب ایک وکیل نے

انہیں فون کیا اور اطلاع دی تو انہیں معلوم ہوا کہ اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ سیکورٹی اداروں کے ارکان رات گئے گھر آئے اور کچھ فائلیں، نقدی اور موٹر سائیکل اپنے ساتھ لے گئے۔ توفیق کو ایک ممنوعہ فرقہ وارانہ انتہا پسند گروپ کے لئے وکلاء کے قتل سمیت دہشت گردی کی سرگرمیوں کی انجام دہی کے الزامات میں دوبارہ گرفتار کیا گیا تھا۔

توفیق کو کراچی میں سنٹرل جیل بھیج دیا گیا تھا اور ہر پیشی پر اسے سٹی کورٹ لایا جاتا تھا۔ ڈیڑھ سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا اور کیسز ابھی تک جاری تھے۔ فاطمہ کے مطابق، جیل میں توفیق کی حالت خراب ہو چکی ہے اور اس کے جسم پر آبلے پڑ چکے تھے جن میں انفیکشن پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے ملاقاتوں کے دوران، وہ اس کے لئے کپڑے، خوراک اور دوائیں لے کر جاتی ہے۔ وہ یہ دعویٰ بھی کرتی ہے کہ سیکورٹی اہل کاروں نے توفیق کو چھوڑنے کے بدلے میں رقم کا مطالبہ بھی کیا تھا، لیکن خاندان کے پاس رقم کی ادائیگی کے لئے ضروری وسائل نہیں ہیں۔ اس گروپ نے جس کے لئے توفیق کام کرتا تھا، اس کے لئے ایک وکیل فراہم کر رکھا ہے۔ خاندان اور وہ تنظیم مشترکہ طور پر کیس پر آنے والے اخراجات برداشت کر رہے ہیں۔ اس کی ماں کو یقین کامل ہے کہ اس کا بیٹا بے گناہ ہے اور وہ ان مصیبتوں کے لئے جن سے ان کے خاندان کو گزرنا پڑا ہے، قانون اور انصاف کے نظام کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ بہر حال اس مرتبہ، فاطمہ کی واحد خواہش یہ ہے کہ جب وہ مر جائے تو وہ اس کے جنازے کو کاندھا دے سکے۔

مقصدی تشدد

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، ہمارے ریسرچرز اور تجزیہ کار ایسی ماؤں سے ملے جنہوں نے بہت سے جلاوطن گروپوں کے جانب سے اپنائے گئے پرتشدد طریقوں کو درست قرار دیا تھا، اس کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی مبینہ سرگرمیوں کو بھی درست قرار دیتی ہیں۔ حالانکہ رحیم اللہ کی ماں فاطمہ، کسی بھی پرتشدد سرگرمی میں اپنے بیٹے کے ملوث ہونے سے ان کار کر چکی ہے، اس کی رائے یہ ہے

کہ ''مجاہدین یا طالبان اپنے حقوق کے لئے جنگ کر رہے ہیں..... (حکومت کو چاہیئے) اس تشدد کے خاتمے کے لئے طالبان کے ساتھ بات چیت کرے جب ایسا ہوگا تو تشدد کم ہو جائے گا۔ اس کا یہ ماننا ہے کہ دہشت گردی کی سرگرمیاں بیرونی عناصر کی جانب سے کی جاتی ہیں اور اس کا الزام طالبان پر لگایا جاتا ہے۔ میں اپنے بیٹے اور دیگر تمام بیٹوں کی رہائی چاہتی ہوں۔ میں طالبان کو اپنے بیٹے تصور کرتی ہوں۔'' انٹرویو سے لئے گئے اس اقتباس سے عیاں ہے کہ فاطمہ اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ انتہا پسند ایک نیک مقصد کے لئے تشدد کو اپنا رہے ہیں۔ تاہم، وہ یہ یقین بھی رکھتی ہے کہ تشدد 'بیرونی عناصر' کی جانب سے پھیلایا جا رہا ہے اور یہ کہ غلط لوگوں کو الزام دیا جا رہا ہے۔

اسی طرح، سکینہ کے مطابق، ''جب بے گناہ لوگوں کے خلاف جھوٹے کیسز درج کئے جاتے ہیں، تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے غصے میں جوابی کارروائی کریں گے۔'' اس کیس میں بھی، ماں اس بات کو درست قرار دیتی ہے کہ بہت سے گروپوں اور انفرادی لوگوں کی جانب سے پرتشدد طریقے استعمال کئے گئے ہیں۔ ان انتہا پسندوں نے جو تشدد ترک کرنے کا اعلان کر چکے ہیں، ہماری گزشتہ اشاعت ''ڈاکیومنٹنگ ریڈیکلائزیشن: اے پرسنل ہسٹری آف چوائسس'' کے لئے دیئے گئے انٹرویوز کے دوران بھی اس بات کا مشاہدہ کیا گیا۔ ایک واقعے میں، سوات سے تعلق رکھنے والے ایک فرد نے اپنی ماں کے دباؤ میں آکر انتہا پسندی اختیار کر لی تھی کیوں کہ اس کی ماں نے یہ محسوس کیا تھا کہ طالبان حق پر ہیں۔ اگر ہم سوات کی مثال پر دوبارہ بات کریں، تو مولانا فضل اللہ نے اپنے غیر قانونی ریڈیو اسٹیشنز کو وادی میں خواتین پر اثر انداز ہونے کے لئے استعمال کیا۔ اس نے نا صرف اپنا مال و اسباب ایک مقصد کے لئے عطیہ کرنے بلکہ اپنے بچوں اور مردوں کو جنگ کے لئے بھیجنے کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ مولانا فضل اللہ کی ماں، جس کا اس کی موت سے قبل انٹرویو کیا گیا تھا، چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا جو کچھ کر رہا ہے اسے چھوڑ دے۔ ابتدائی طور پر اس نے اس کی حمایت کی تھی، کیوں کہ وہ اپنے بھائی کی اپنے تین بیٹوں کے ہمراہ ۲۰۰۶ء کے دوران باجوڑ کے ایک مذہبی درس گاہ پر ڈرون حملے میں موت کا انتقام لے رہا تھا۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ وہ یہ کام بند کر دے۔ پاکستان میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں، جہاں نوجوان لڑکے اپنی

ماؤں یا خاندان کے دیگر ارکان کی جانب سے متحرک کئے جانے کے بعد انتہا پسندوں کے ساتھ شامل ہونے کے لئے اپنے گھروں کو چھوڑ چکے ہیں۔

درست اور غلط

فاطمہ اور اس کے بیٹے کی کہانی کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: فاطمہ کی رائے میں طالبان اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں، جب کہ دہشت گردی کی سرگرمیاں کسی اور کی جانب سے انجام دی جا رہی ہیں اور ان کا الزام طالبان کی طرف منتقل کیا جا رہا ہے۔ فاطمہ کا تیس سالہ بیٹا رحیم اللہ ایک رکشہ ڈرائیور تھا اور تین بچوں کا باپ بھی تھا۔ اسے پانچ سال قبل جرائم کی تحقیقات کرنے والے ادارے سی آئی ڈی نے گرفتار کیا تھا اور اس سے پہلے کہ اس کے خاندان کو یہ پتہ چلتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے، وہ پانچ روز کے لئے ان کی تحویل میں رہا تھا۔ فاطمہ کو اپنے بیٹے سے ملاقات کرنے کے لئے ایک درخواست پیش کرنا پڑی تھی، جہاں اس کے مطابق، اس نے اس کے پورے جسم پر تشدد کے نشانات دیکھے تھے۔ اس کی حالت کی وجہ سے وہ اسے پہچان نہیں پائی تھی۔ آخری مرتبہ اس نے اسے دو سال قبل دیکھا تھا، کیوں کہ اسے دوسری مرتبہ اجازت نہیں دی گئی تھی۔ رحیم اللہ پر دہشت گردی اور اغوا کے تحت الزامات لگائے گئے تھے، جب کہ فاطمہ کو یقین تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔ وہ یہ دعویٰ بھی کرتی ہے کہ پولیس نے دستاویزات میں غلط طور یہ رپورٹ کیا ہے کہ انہوں نے اسے شہر کے ایک مختلف علاقے سے گرفتار کیا تھا۔ فاطمہ اس کی بے گناہی کے طور پر اپنے بیٹے کی مذہب سے قربت کا نمایاں ترین عنصر کی حیثیت سے حوالہ دیتی ہے۔ وہ یقین رکھتی ہے کہ مذہبی اقدار کا حامل کوئی فرد ایسی سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ خاندان نے رحیم اللہ کا عدالت میں دفاع کرنے کے لئے ایک وکیل کی خدمات حاصل کی ہیں، جب کہ کسی نے بھی ان کی مدد کے لئے رابطہ نہیں کیا۔ فاطمہ جب اپنے بیٹے کی رہائی کی لئے دعا کرتی ہے تو اس کے آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ فاطمہ کہتی ہے کہ اگر اس کا بیٹا رہا کر دیا جاتا ہے، تو اسے سختی سے یہ نصیحت کرے گی کہ وہ اپنے کام کے علاوہ باقی ہر چیز سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لے۔ وہ حکام سے بھی اپیل کرتی ہے کہ

طالبان سے گفت وشنید کریں اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ''یہ غیر ملکی عناصر ہیں، جو ملک میں دہشت گردی کر رہے ہیں..... میں طالبان کو اپنے بیٹے تصور کرتی ہوں۔''

ذمہ دار کون؟

ذمہ داری قبول کرنے کی بجائے کسی اور کو مورد الزام ٹھہرانے کا عمل ہمارے معاشرے میں چھوت کی بیماری کی طرح پھیل چکا ہے۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ الزام کی تصدیق کر دینے سے ان کا بیٹا بری نہیں ہوسکتا اور ان کی تربیت بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ الزام کسی دوسرے پر لگا کر مائیں شاید نا صرف اپنی اولاد کو تحفظ دے رہی ہیں بلکہ اپنی پرورش کو تنقید سے بچانے کی بھی کوشش کر رہی ہیں۔ انٹرویوز کے دوران بار بار انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ انہوں نے اپنے بچوں کی اچھی طرح تربیت کی ہے، لہٰذا وہ ان کی بے گناہی کے بارے میں پر اعتماد ہیں۔

مثال کے طور پر، امجد حسین اور اعظم فاروق کے کیس پر غور کریں، جنہیں دہشت گردی کے الزامات کے تحت پکڑا گیا تھا۔ ان کی ماں کی یہ رائے تھی کہ ''دہشت گردی کی ان سرگرمیوں کے لئے سیاسی پارٹیاں ذمہ دار ہیں۔ وہ خفیہ اداروں کے تعاون سے ایسی سرگرمیاں کرتے ہیں۔'' فاطمہ، کسی بھی تشدد میں اپنے بیٹے کے ملوث ہونے سے انکار کے بعد کہتی ہے، ''کوئی اور یہ کام کرتا ہے اور الزام کسی اور پر لگا دیا جاتا ہے..... دہشت گردی کی سرگرمیاں غیر ملکی عناصر کی جانب سے انجام دی جاتی ہیں اور الزام طالبان پر منتقل کر دیا جاتا ہے۔'' ام تمیم نے بھی یہ کہتے ہوئے الزام منتقل کر دیا کہ، ''یہ امریکہ کا کام ہے۔ ہمارے مسلمان بھائی ایسی سرگرمیاں انجام نہیں دے سکتے ..... ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو کبھی نہیں مار سکتا..... یہ کام اس وقت سے جاری ہے جب سے امریکہ یہاں موجود ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مذہبی پس منظر رکھنے والے بچوں کو دہشت گردوں کا درجہ دے دیا جائے۔''

آیئے ہم ام تمیم کے بیٹے حافظ قاسم رشید کے کیس پر باریک بینی سے ایک نظر ڈالتے ہیں۔

قاسم کی عمر تیس برس سے کچھ کم ہے اور وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اندرون سندھ رہتا ہے، جب کہ باقی ماندہ خاندان کراچی میں مقیم ہے۔ پہلے بھی قاسم کو گرفتار کرلیا گیا تھا اور ایک ہی وقت میں اس کے خلاف دہشت گردی کے نو کیس درج کئے گئے تھے اس کو بری کروانے میں چار سال سے زیادہ عرصہ لگا تھا۔ ماں نے جب اس سے ان الزامات کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ، ''میرے خلاف یہ الزامات جھوٹے ہیں۔'' ماں کے مطابق، ''اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اسے بے گناہ قرار دے دیا جائے گا کیوں کہ ان کے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے، اور اسے بے گناہ قرار دے دیا گیا۔'' اسے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے ۲۰۱۲ء میں دوبارہ گرفتار کرلیا گیا اور وہ چار روز تک غائب رہا۔ پولیس بھی ممنوعہ تنظیموں کے ساتھ اس کی وابستگی کا کہتی ہے۔ ام تمیم یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس کے بیٹے کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا، اور کہتی ہے کہ ''اس کی بہت بری حالت تھی وہ چل نہیں سکتا تھا کیوں کہ اس کے پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ جس کسی کو بھی ایسا ظالمانہ تشدد برداشت کرنا پڑتا ہے تو وہ قتل کا بھی اعتراف کرلے گا۔'' یہ واضح ہے کہ ماں اپنے بیٹے کے بیان پر یقین کرتی ہے، اور ماضی کے کسی واقعے میں اس کے مبینہ طور پر ملوث ہونے کے باوجود، وہ اسے بے گناہ تصور کرتی ہے۔ ''میرا بے چارہ لڑکا بے گناہ ہے۔ میرے تمام بچوں میں سے، وہ سب سے زیادہ ذہین اور ذمہ دار ہے۔ وہ روزمرہ کے گھریلو کاموں میں بھی مدد کرتا ہے..... ہمارے بچوں کے پاس تو کھیلنے کے لئے غلیل تک نہیں ہے، تو پھر ہم کلاشنکوفیں کہاں سے لیں گے؟'' ام تمیم خطے میں موجود غیر ملکی فوجیوں پر الزام منتقل کردیتی ہے کہ وہ مذہبی پس منظر رکھنے والے نوجوانوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ وہ یہ رائے رکھتی ہے کہ دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والے اصل افراد آزاد گھوم رہے ہیں، جب کہ بے گناہ نوجوانوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ ایسے جرائم میں اصل میں ملوث لوگوں کے سلسلے میں وہ یہ دعویٰ کرتی ہے، ''یہ امریکہ کا کام ہے۔ ہمارے مسلمان بھائی کبھی ایسی سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہو سکتے۔'' اسے یقین ہے کہ اصل مجرموں کو گرفتار کرنے کی بجائے معاشرے کے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو حکام کی جانب سے نشانہ بنایا جارہا ہے۔

سکینہ انجم کا کیس بھی کوئی زیادہ مختلف نہیں ہے، جس کے بیٹوں امجد حسین اور اعظم فاروق کو حکام نے دہشت گردی کے الزامات پر پکڑ لیا تھا ان میں سے ایک بھائی کا نام کراچی میں رینجرز ہیڈکوارٹرز پر راکٹ حملے کے حوالے سے سندھ پولیس کی مطلوبہ لسٹ میں درج ہے۔ امجد اور اعظم کو لاہور اور گوجر خان سے گرفتار کیا گیا تھا، کیوں کہ اس وقت وہ وہاں پر کام کر رہے تھے اور رہائش پذیر تھے۔ ان کا اتہ پتہ آٹھ ماہ تک معلوم نہیں ہوسکا تھا، جب کہ اس دوران سکینہ نے نا صرف قانونی اقدامات اپنا لئے تھے، بلکہ گم شدہ افراد کی بازیابی کے لئے احتجاجوں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ بالآخر امجد اور اعظم کا اتہ پتہ اس وقت معلوم ہوسکا جب خاندان نے عدالت سے رجوع کیا اور اس کے نتیجے میں دونوں بھائی رہا کر دیئے گئے کیوں کہ ان کے خلاف الزامات ثابت نہیں ہو سکے تھے۔ سکینہ سارا الزام خفیہ اداروں، سیاسی پارٹیوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو منتقل کرتی ہے۔ سیاسی پارٹیوں اور خفیہ اداروں پر الزام تراشی اس کے پہلے دیئے گئے بیانات سے ظاہر ہے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے بارے میں وہ کہتی ہے کہ ''ترقیاں حاصل کرنے کی جستجو میں پولیس بے گناہ نوجوانوں کو گرفتار کرتی ہے اور ان کے خلاف کیسز درج کرواتی ہے..... میں انہیں صرف یہ نصیحت کر سکتی ہوں کہ جھوٹے مقدمات درج کرنا چھوڑ دیں تا کہ آپ بھی اچھی زندگی گزار سکیں۔''

اختتامیہ

مائیں اپنے بچوں کی زندگی کی جیتی جاگتی شہادتیں ہیں۔ وہ ان کو اس دنیا میں لانے کا بوجھ اور تکلیف برداشت کرتی ہیں اور انہیں مختلف اعلیٰ مقامات پر دیکھنے کی خواہش رکھتی ہیں اور اس کے لیے تگ ودو کرتی ہیں۔ یقیناً بہت سے بیرونی عوامل بھی افزائش اور ذہنی وجسمانی نشوونماء پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور ان وجوہات میں سے یہ ایک ہے کہ جس کی وجہ سے ہم نے تشدد کا شکار اور ارتکاب کرنے والوں کی ماؤں کے احساسات اور خیالات ریکارڈ کرنے کے اس کام کا بیڑہ اٹھایا۔

عام تصور یہ ہے کہ وہ مائیں جو دہشت گردی کے نتیجے میں اپنے بیٹے کھو دیتی ہیں صرف وہی تکلیف کا شکار ہوتی ہیں۔ جب کہ ایک پہلو جسے ہم اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک دہشت گرد کی ماں بھی بے پناہ کرب سے گزرتی ہے۔ ظاہری طور پر، وہ محض ایک دہشت گرد کی ماں ہوگی اور یہ سمجھا جائے گا کہ یا تو وہ اپنے بیٹے کی سرگرمیوں سے منسلک ہے یا اس کی بھی وہی ذہنیت ہے جو اس کے بیٹے کی ہے۔ تاہم، حقیقت مکمل طور پر عام تصور کے برعکس ہے۔ جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں، مذہب کے نام پر پرتشدد تنظیموں کی سازباز، ملک میں لاقانونیت کا راج اور ریاست کی جانب سے ان کے حقوق کی خلاف ورزی ان ماؤں کی ذہنیت کو تبدیل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

زیر بحث کہانیاں پاکستان میں عسکریت پسندی اور اس کے عوامی سطح پر ابھرنے کا تصور فراہم کرتی ہیں۔ اس دستاویز کا مقصد بالکل بھی ایسی تجاویز پیش کرنا نہیں تھا کہ معاشرے میں ایسے دہشتگرد عناصر سے کیسے نمٹنا چاہیئے۔ بلکہ اس کا واحد مقصد ذہنیت، درپیش چیلنجوں، اور ان عناصر کی نشان دہی کرنا ہے جو ماں کو یہ یقین کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ، ایک پرتشدد راستہ اپناتے ہوئے، اس کا بیٹا دراصل کوئی ایسا کام کر رہا ہے جس کا کہ مذہب تقاضہ کرتا ہے یا وہ معاشرے کی ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ مزید برآں، یہ ان چیلنجوں اور رکاوٹوں کو بھی نمایاں کرتی ہے جن کا ان ماؤں کو سامنا ہے جو دہشت گرد سرگرمیوں کے نتیجے میں اپنے بچوں کو کھو چکی ہیں۔

دہشت گردی کا شکار اور ارتکاب کرنے والے دونوں کی ماؤں کو درپیش مسائل کبھی کبھار ایک دوسرے سے بالکل برعکس ہوتے ہیں اور کبھی بالکل ایک جیسے۔ تاہم، انٹرویوز سے معلوم ہوا کہ دہشت گردی کے مسئلے سے نمٹنے میں ریاست کا کردار یا ریاست کی نااہلی دونوں طرح سے متاثرہ ماؤں کے درمیان ایک مشترکہ مسئلہ ہے۔ دہشت گردی کا شکار ہونے والوں کی ماؤں کو بھی کسی مالی معاونت یا سماجی تحفظ اور انصاف کی غیر موجودگی یا اس کی فراہمی کو یقینی بنانے کے سلسلے میں تحفظات ہیں۔ دوسری جانب، تشدد کا ارتکاب کرنے والوں کی ماؤں کو قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اختیارات پر تشویش ہے۔

مسئلہ محض ریاستی امور، قانون نافذ کرنے والے اداروں اور انصاف فراہم کرنے والے اداروں پر ان ماؤں کی عدم اعتمادی کا نہیں بلکہ بہت سے ایسے عوامل ہیں جن کا انجام انہیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ہمارے ملک میں ایسے ادارے نہیں جو دہشتگردی کے واقعات کے بعد متاثرہ افراد اور خاندانوں کی مالی اور نفسیاتی بحالی کے لیے کام کر سکیں۔ ہماری وہ مائیں جو بے خبر ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ دہشتگردی غیر ملکی افراد کا کام ہے اور وہ مذہبی اور فرقہ واریت کی تعلیم سے اور طالبان کے نقطہ نظر سے آگاہ نہیں انہیں آگاہی فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ ریاستی اداروں کو مضبوط بنانے کے علاوہ، ماؤں کو سرگرم کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ مقصد ماؤں کو بیدار کرنے اور انہیں اپنے بچوں کی زندگی پر اثر انداز ہونے اور ان کی رہنمائی کرنے اور انہیں تشدد اور دہشت گردی کی سرگرمیوں میں ملوث ہونے سے روکنے میں اپنی صلاحیت سے آگاہ کرنا ہے۔

ہمارے ملک میں بہت سے کالعدم ادارے ہیں جنہوں نے معاشرے کو بری طرح سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے ان کے چنگل سے معاشرے کا کوئی بھی فرد محفوظ نہیں ہے۔ اگر یہاں میں صرف ایک ادارے کی مثال دوں کہ وہ کس طریقے سے کام کر رہا ہے تو آپ بہت آسانی سے جان سکیں گے کہ ان کی سرگرمیاں کیا ہیں۔ مثال کے طور پر ایک تنظیم کو جب کالعدم قرار دیا جاتا ہے تو وہ اپنا نام تبدیل کر کے سرگرمیاں جاری رکھتی ہے۔ اس تنظیم کا ایک سماجی فلاح و بہبود کا ادارہ بھی ہے جو کہ لوگوں کی فلاح کے لیے تو کام کرتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی سرگرمیوں کو سوشل میڈیا جس میں ٹوئیٹر اور فیس بک سرِ

فہرست ہیں اس پر بھی اپنی سرگرمیاں پوسٹ کرتے رہتے ہیں۔ اس تنظیم کی مختلف ویب سائیٹس بھی موجود ہیں۔ اسی طرح ان کے اسٹوڈنٹ ونگ بھی ہیں وہ ان کی کیریئر کونسلنگ بھی کرتے ہیں اور ان کو اپنے پیغامات دوسروں تک پہنچانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مختلف اسکولوں، کالجوں میں ان ہی کا نقطہ نظر رکھنے والے اساتذہ تو موجود ہیں ہی لیکن سونے پر سہاگہ یہ کہ ان کے اپنے اسکول بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اپنے میڈیا ہاؤس ہیں، جہاں سے وہ جہادی مواد چھاپتے ہیں جس میں عورتوں، بچوں، نوجوانوں کے لیے میگزینز، نیوز پیپرز، کتابیں، پمفلٹ اور بینر وغیرہ شامل ہیں۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کالعدم تنظیمیں اپنا کام کہیں ڈھکے چھپے کرتی ہوں گی اور زیادہ لوگوں تک ان کا پیغام نہیں پہنچ سکتا ہوگا، لیکن جب سوشل میڈیا کی بات آتی ہے تو فیس بک اور ٹوئیٹر پر ان کے پیج، گروپ اور لوگ موجود ہیں، نا صرف تنظیم کے نام سے بلکہ ان کی کتابوں، اسٹوڈنٹ ونگ، میگزینز، اخبارات کے نام سے بھی پیج اور ویب سائیٹس موجود ہیں، کوئی بھی ان کے اخبارات اور رسائل آن لائن آرڈر کر کے بھی منگوا سکتا ہے۔ ان کے اپنے آن لائن ٹیلی ویژن اور ریڈیو چینل ہیں۔ اس طرح کی ویب سائیٹس بنانے والے بھی ہیں جو محض ان کے لیے کام کرتے ہیں اور ایک کی طرز کی ویب سائیٹس بناتے ہیں۔ یوٹیوب، ٹیون پی کے اور ڈیلی موشن جیسی مین ویب سائیٹس پر ان کی ویڈیوز بے انتہا موجود ہیں۔ پھر ہمارے ٹیلی ویژن والے ان کالعدم تنظیموں کے لیڈروں کو اپنے پروگراموں میں بلوا کر عام لوگوں کو ان کی جانب متوجہ کرواتے ہیں۔

کالعدم تنظیموں کی سرگرمیوں کو بے نقاب کیا جانا چاہیے۔ کچھ عرصے سے ہم پاکستان کے نیشنل ٹیلی ویژن پر ایسے اشتہارات دیکھ رہے ہیں جن میں کالعدم تنظیموں سے اور ان کی سرگرمیوں سے آگاہی فراہم کی جا رہی ہے۔ حکومتی سطح پر مزید اقدامات کیے جانے کی ضرورت تو بلا شبہ ہے ہی لیکن معاشرے کی بقاء کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد اپنا کردار ادا کرے اور اس بات سے آگاہ ہو کہ ملک میں جو کالعدم ادارے کام کر رہے ہیں ان کی درسگاہوں، سماجی بہبود کے ادارے اور لٹریچر کو پہچان سکیں کہ وہ کس نقطہ نظر کی عکاسی کر رہا ہے۔

چندہ دیتے ہوئے اس بات کو مدِ نظر رکھیں کہیں کسی ایسے ادارے کو چندہ تو نہیں دے رہے جو کالعدم ادارہ ہے۔

کام کے حوالہ جات

Ahmad, G.B., Ahmed, A., Ahmad, Y., Haider , Z., & Swati, H. K. (2012). Personal histories of choices : Documenting renuciation .Islamabad, Pakistan: Dotlines.

Dawn. (2007, January 24). *Karachi: SSP man given in judicial custody.* Retrieved from Dawn.com:http://beta.dawn.com/news/229633/karachi-ssp-man-given-in-judicial- custody

Jacobson, M. (2010). *Learning counter-narrative lessons from cases of terrorist dropouts.* National Coordinator for Counterterrorism (NCTb). COLOPHON. Retrieved December 10, 2013 from http://www.washingtoninstitute.org/uploads/Documents/opeds/4b 7aaf56ca52.pdf

McLeod, S. (2009). Attachment Theory. Retrieved from simply Psychology: http://www.simplypsychology.org/attachment.htm.

Moseley, A. (2009, February 10). Just War Theory, Retrieved form Internet Encyclopedia of Philosophy: http//www.iep.utm.edu/justwar/

Resilient Communities. (2013, October 22). Empowering women to counter violent extremism. Retrieved from Resilient Communities: http://www.resilientcommunities.gov.au/newsandblog/Pages/Empoweringwomentocounterviolentextremism.aspx.

Resilient Communities. (N.d.). Empowering women to counter violent extremism: News and Blog. Retrieved from Resilient Communities.

Resilint Communities. (2013, October 22). Empowering Woment to counter violent extremism. Retrieved from Resilient Communities:
http://www.reilientcommunities.gov.au/new.sandblong/Pages/Empoeringwomentocounterviolentextremism. aspx.

South Asian Terrorism Portal (SATP). (N.d.). Fatalities in Terrorist Violence in Pakistan 2003- 2013. Retrieved from South Asian TerrorimPortal(SATP)
:http://www.satp.org/satporgtp/countries/pakistan/database/casualities.htm.

TED Talks. (2011, May). *Aicha el-Wafi + phyllis Rodriguez: The mothers who found forgiveness, friendship.* Retrieved from TED: Ideas worth spreading:
http://www.ted.com/talks/9_11_healing_the_mothers_who_found_forgiveness_friendship.Html

The Express Tribune. (2012, February 3). *Behind bars: CID arrests three suspect for Shia* killings Retrieved from The Express Tribune:
Http://tribune.com.pk/story/331072/behind-bars-cid-arrests-three-suspects-for-shia-Killings/

The News International. (2012, January 12). *Senior lawyer handlilng missing persons cases Gunned down.* Retrieved from The News International:
http://www.thenews.com.pk/TodaysPrintDetail.aspx?ID=87056&Cat=4

University Southern Carolina. (n.d.). *Shifting Blame is Socially Contagious.* Retrieved from university Southern Carolina: http: pressroom. Usc. Edu/shifting- is socially-Contagious/

Weisman, A. G., Gomes,L.G., & Lopez, S. R. (2003, September). Shifting blame away from ill Relatives: Latino families' reactions to schizophrenia. *The Journal of Nervous and Mental Disease, 191(9),* 574 - 581 Retrieved December 02, 2013, from Http: //dornsife.use.edu/assetes/375/docs2003 Weisman _Gomes(Lopez. Psd

Wenger, A., & Fowers, B. J. (2008, march). Positive Illusions in Parcenting; Every child is Above Average. *Journal of Applied Social Psychology. 38(3), 611 - 634.*Doi: 10.1111/j.1559-1816.2007.00319.x

Women without Borders. (2013, December 02). Retrieved from Women without Boarders: Http://www.women-without-borders.org/

Six men (1977) Alistair Cooke, profile of Bartrand Russel; The Lord of Reason. Penguin Books.

http://newsweekpakistan.com/lady-parts/